اسرائیل فلسطین تنازعہ

الصراع الإسرائيلي الفلسطيني

تاریخی حقائق کی روشنی میں

في ضوء الحقائق التاريخية

ایک تحقیقی اورعلمی بحث/مقالہ

بحث ومناقشة علمية/أطروحة

الطاف حسین

اسرائیل۔فلسطین تنازعہ

Israel - Palestine Conflict:

تاریخی حقائق کی روشنی میں علمی اور تحقیقی مقالہ

Research Paper

in the Light of Historical Facts

از

الطاف حسین

13،نومبر 2023ء

(ترمیمی ایڈیشن)

معزز قارئین کرام! .....Dear Readers!

اسرائیل۔فلسطین تنازعے کو سمجھنے کیلئے نئی نسل کے نوجوانوں، تاریخ کے طلباء وطالبات اور عوام کیلئے یہ جاننا انتہائی ضروری ہوگا کہ فلسطین کیا ہے؟.....اسرائیل کیا ہے؟.....فلسطین۔اسرائیل تنازعہ کیا ہے؟.....فلسطین اور اسرائیل کے درمیان اِس تنازعے نے کب سے جنم لیا؟

میں پوری کوشش کروں گا کہ اس تنازعے کو اِس طرح بیان کروں کہ طالب علموں کے ساتھ ساتھ ہر خاص وعام طبقہ سے تعلق رکھنے والے عوام اُسے با آسانی سمجھ سکیں۔

تاریخِ فلسطین ..... (History of Palestine)

فلسطین ایک بہت قدیم جغرافیے پر مبنی ایسا خطہ (علاقہ) ہے جس کی تاریخ بھی بہت قدیم (بہت پرانی) ہے۔فلسطین کی ابتدائی تاریخ اُس زمانے کی ہے جس زمانے کو BCE کہا جاتا ہے یعنی وہاں پر ابتدائی زمانے کے ایسے لوگوں کے وجود کا ذکر ملتا ہے جنہیں زمانہءقبل از تاریخ (Prehistoric Time) کے دور کا انسان کہا جاتا ہے۔

آسان اور سادہ الفاظ میں BCE اُس دور کو کہا جاتا ہے جسے عرف عام میں پتھر کا قدیم زمانہ (Old Stone Age) کہا جاتا ہے۔

BCE کی اصطلاح کو تین طریقوں سے بیان کیا جاتا ہے یا انگریزی زبان میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ

BCE کی تین تعریفیں..... (Three Definitions of BCE)

(1) عام دور سے پہلے ..... Before Common Era

(2) موجودہ دور سے پہلے..... Before Current Era

(3) مسیحی دور سے پہلے..... Before Christ Era

خطہءفلسطین کے وجود کے بارے میں تاریخ کی کتابوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ فلسطین کا علاقہ

اتنا پرانا ہے کہ یہاں پتھر کے قدیم زمانے کے لوگوں کے رہنے کے اثرات ملتے ہیں یا پائے جاتے ہیں۔ فلسطین کی پوری قدیم تاریخ میں اِس خطے نے مختلف سلطنتوں اور تہذیبوں کے عروج وزوال کا مشاہدہ کیا ہے۔

کنعانی ..... (Canaanites) کون تھے؟

کنعانی (Canaanites) اِس سرزمینِ فلسطین کے سب سے قدیم ترین باشندے تھے۔ قدیم تاریخی کتابوں کے مطابق یہ کنعانی لوگ ''سامی'' (Semitic-Speaking) زبان بولتے تھے۔ یہ کنعانی لوگ ایک علاقہ جسے کنعان (Canaan) کہا جاتا ہے اُس علاقے میں آباد تھے۔ آج کے موجودہ دور کے مطابق کنعان (Canaan) کا یہ رقبہ لبنان، اسرائیل، فلسطین، اُردن اور شام کے حصوں پر مشتمل تھا۔

ان کنعانیوں نے ''کانسی کے دور'' (Bronze Age) کے اواخر میں زرعی طریقوں میں جدیدیت، تجارتی نیٹ ورکس کے علاوہ شہری ریاستوں کے قیام میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان کنعانیوں کے مذہب میں بہت سے دیوتاؤں کو پوجا جاتا تھا۔

اسرائیلی ..... (Israelites)

اسرائیلیوں سے مراد قدیم عبرانی لوگ (Hebrew People) ہیں جو کتابِ مقدس بائبل (Bible) کے مطابق حضرت یعقوبؑ کی اولاد تھے۔ اب یہاں یہ بات سمجھنا اشد ضروری ہے کہ حضرت یعقوبؑ کون تھے؟

حضرت یعقوبؑ، حضرت اسحاقؑ کے بیٹے تھے۔ شجرہ ءنسب اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ

حضرت ابراہیمؑ (Hazrat Ibrahim AS or Abraham) کے بیٹے

حضرت اسحاقؑ (Hazrat Ishaq AS or Isaac) تھے اور ان کے بیٹے حضرت یعقوبؑ

(Hazrat Yaqoob AS or Jacob) تھے یعنی کہ حضرت یعقوبؑ، حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے۔

حضرت یعقوبؑ (Hazrat Yaqoob AS) کا لقب حضرت اسرائیلؑ (Hazrat Israel AS) تھا۔

حضرت یعقوبؑ کو کب اور کس طرح اسرائیل کا لقب عطا ہوا یا دیا گیا؟

بائبلی تاریخ (Biblical History) کے مطابق حضرت یعقوبؑ کی زندگی میں ایک اہم واقعہ پیش آیا اور وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک رات کو ایک فرشتے نے آکر حضرت یعقوبؑ سے کُشتی (Wrestling) کا مقابلہ کیا اور یہ مقابلہ پوری رات جاری رہا اور حضرت یعقوبؑ نے اللہ کی مدد سے اُس فرشتے پر قابو پالیا تھا۔ اُس پر فرشتے نے حضرت یعقوبؑ کو ''اسرائیل'' کا خطاب دیا تھا۔ جس کا مطلب ہے کہ ''خدا (اللہ) کی مدد سے لڑنے والا''

حضرت یعقوبؑ کو عبرانی (Hebrew) زبان میں ''یاکوف'' (Yaakov) کہا جاتا ہے جبکہ عربی زبان میں یعقوب (Yaqoob) کہا جاتا ہے۔

حضرت یعقوبؑ کے 12 بیٹے تھے اس طرح حضرت یعقوبؑ (Jacob) کی اولادوں اور اُن سے آنے والی اولادوں (Generations) کو ''بنی اسرائیل'' کہا جاتا ہے جنہیں انگریزی زبان میں "Israelites" کہتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے لوگوں کا وجود خطہء فلسطین میں 12 ویں صدی قبل مسیح (BCE) کے آس پاس سامنے آیا۔

یہاں میں ایک وضاحت کردوں کہ حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے، ایک کا نام حضرت اسمٰعیلؑ تھا جبکہ دوسرے بیٹے کا نام حضرت اسحاقؑ تھا۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی پرورش عرب کے شہر مکہ میں ہوئی جبکہ حضرت اسحاقؑ کی پرورش فلسطین کے علاقے میں ہوئی۔

آشوری اور بابلی سلطنتیں:

(Assyrian and Babylonian Empires)

8 ویں صدی قبل مسیح (8th BC) میں فلسطین کے علاقے میں دو اور سلطنتیں آشوری (Assayrian) اور بابلی (Babylonian) کے نام سے قائم ہوئیں۔

A.D کا دورانیہ:

A.D کے دورانیے کو بتانے سے پہلے نئی نسل کے نوجوانوں کو یہ بتلانا ضروری ہے کہ A.D کا مطلب کیا ہے؟A.D کا مطلبAnno Dominiیعنی A Year After Jesus Christ Was Born ہے جس کا آسان زبان میں مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے بعد کے آنے والے تمام سال۔یعنی کہ آج میں جس سال یہ مقالہ(Thesis) تحریر کر رہا ہوں وہ سال2023ءA.D کا سال ہے۔

خطہء فلسطین نے عیسوی دور میں کئی سلطنتوں کے عروج وزوال ، بڑے عالمی مذاہب کے پھیلاؤ اور سامراجی طاقتوں کے اثرات کو دیکھا۔

رومن اور بازنطینی سلطنتیں..... (Roman and Byzantine Empires)

رومی سلطنت نے 63ویں قبلِ مسیح میں فلسطین پر قبضہ کیا اور اِس طرح فلسطین، رومی سلطنت کا حصہ بن گیا ۔ایسٹرن رومی سلطنت کا حصہ بعد میں بازنطینی سلطنت (Byzantine Empire) کی شکل میں قائم ہوا۔

اسلامی سلطنتیں .....(Islamic Empires)

ساتویں صدی عیسوی میں خلافتِ راشدین کی فوجوں نے فلسطین کو فتح کیا اور اس پورے خطے میں اسلام کو پھیلایا۔اس کے بعد صدیوں کے دوران یہ خطہء فلسطین مختلف اسلامی خاندانوں کے کنٹرول میں رہا جن میں اموی(Umayyads)،عباسی(Abbasids)اور فاطمی(Fatimids)خاندان شامل تھے۔

فلسطین پر مسلم حکومتوں کا دورانیہ .....(Period of Muslim rule over Palestine)

1۔اموی(Umayyads)دورِحکومت.....661ء سے750ء

2۔عباسی(Abbasids) دورِحکومت.....750ء سے1258ء

3۔فاطمی(Fatimids)دورِحکومت.....909ء سے1171ء

صلیبی جنگیں ..... (Crusades)

11 ویں سے 13 ویں صدیوں میں یورپی عیسائیوں کے ذریعہ مقدس سرزمین (یروشلم) پر دوبارہ دعویٰ کرنے کیلئے صلیبی جنگوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ جب یورپی عیسائیوں نے اِن صلیبی جنگوں کا آغاز کیا اُس وقت یروشلم مسلمانوں کے کنٹرول میں تھا۔ ان جنگوں سے اِس خطے پر گہرا اثر پڑا جو صلیبی ریاستوں کے قیام کا سبب بنیں۔

سلطنتِ عثمانیہ..... (Ottoman Empire)

16 ویں صدی میں سلطنتِ عثمانیہ نے فلسطین کو فتح کیا اور کئی صدیوں تک اِس خطے پر حکومت کی۔ اِس دوران ''یروشلم'' اسلام، عیسائیت اور یہودیت کا ایک اہم مرکز بن گیا۔

برطانوی مینڈیٹ..... (British Mandate)

پہلی جنگِ عظیم (1914ء سے 1918ء) کے خاتمے کے ساتھ ساتھ سلطنتِ عثمانیہ کا بھی اختتام ہوا جس کے بعد برطانیہ نے لیگ آف نیشنز مینڈیٹ (League of Nations Mandate) کے تحت فلسطین کا کنٹرول سنبھال لیا۔ اِس دور میں پوری دنیا سے یہودیوں کی امیگریشن میں اضافہ ہوا اور ساتھ ساتھ عربوں اور یہودیوں کے درمیان پائی جانے والی کشیدگی میں بھی مزید اضافہ ہوا۔

اب میں فلسطین اور اسرائیل تنازعے کے تازہ ترین حالات سے نئی نسل کے نوجوانوں اور قارئینِ کرام کو آگاہ کردوں کہ 1918ء میں جنگِ عظیم اوّل کے اختتام کے بعد برطانوی سلطنت نے فلسطین کا کنٹرول سنبھال لیا تھا تو اس کے بعد کیا ہوا۔

یہ بیان کرنے سے پہلے میں چند اہم ضروری اور بنیادی نکات بیان کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں تاکہ نوجوان نسل سے تعلق رکھنے والے اُس سے آگاہ ہوسکیں۔ جنگِ عظیم اوّل اور جنگِ عظیم دوئم کے بارے میں آپ تمام قارئین متعدد مرتبہ سُن اور پڑھ چکے ہوں گے۔ آیئے! ان دونوں جنگوں کے بارے میں کچھ مزید جانتے ہیں۔

1۔ جنگِ عظیم اوّل ..... (First World War)

اس پہلی جنگِ عظیم کا آغاز 28 جولائی 1914ء کو ہوا جو 11، نومبر 1918ء کو اختتام پذیر ہوئی۔ یہ جنگ دو بڑی پاورز کے درمیان ہوئی جنہیں Alies Powers اور Central Powers کے نام سے جانا جاتا ہے۔

(A) الائیز پاورز: (Alies Powers)

الائیز پاورز میں برطانیہ عظیم یا عظیم برطانیہ (Great Britain)، فرانس، روس، یونائیٹڈ اسٹیٹس (US)، اٹلی اور جاپان شامل تھے۔

(B) سینٹرل پاورز: (Central Powers)

سینٹرل پاورز میں جرمنی، آسٹریا، ہنگری، بلغاریہ، سربیا اور سلطنتِ عثمانیہ شامل تھے۔

2۔ جنگِ عظیم دوئم ..... (Second World War)

یہ جنگ بھی دو بڑے گروپس کے درمیان ہوئی جس کا آغاز یکم ستمبر 1939ء کو ہوا اور 2، ستمبر 1945ء کو اختتام ہوا۔ یعنی یہ جنگ 6 سال ایک دن تک جاری رہی۔ دو بڑے گروپوں میں ایک گروپ ایکسس پاورز (Axis Powers) اور دوسرا گروپ دی الائیڈ (The Allied) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

(A) ایکسس پاورز (Axis Powers)

ایکسس پاورز میں جرمنی، اٹلی اور جاپان شامل تھے۔

(B) الائیڈ پاورز (Allied Powers)

الائیڈ پاورز میں فرانس، گریٹ بریٹن، یو ایس اے اور سوویت یونین شامل تھے جبکہ چائنا بھی کسی حد تک شامل تھا۔

لیگ آف نیشنز کا قیام .....(Formation of League of Nations)

بین الاقوامی دنیا کے درمیان امن کے قیام اور رابطے کے لئے 40 سے زائد ممالک نے مل کر 10 جنوری 1920ء کو ''لیگ آف نیشنز'' (League of Nations) قائم کی جس کا اختتام 19 اپریل 1946ء کو باقاعدہ طور پر ہوا۔

اقوام متحدہ کا قیام .....(Foundation of United Nations)

24 اکتوبر 1945ء کو اقوام متحدہ کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے باقاعدہ ابتدائی ممبران ممالک کی تعداد 51 تھی۔ فلسطین کی تاریخ کے بارے میں، میں ابتدائی صفحات میں کسی حد تک پہلے ہی بتا چکا ہوں لیکن اب میں نئی نسل کے نوجوانوں اور قارئینِ کرام کو بتانا چاہتا ہوں کہ فلسطین کا علاقہ (خطہ) کس طرح تقسیم کیا گیا۔

(3) علاقہ فلسطین کی تقسیم .....(Partition Of Palestien)

جیسا کہ میں اپنی تحریر میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ 1918ء میں پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد لیگ آف نیشنز مینڈیٹ کے تحت سلطنتِ برطانیہ نے فلسطین کا کنٹرول سنبھال لیا تھا جسے جنگِ عظیم دوئم یعنی 1945ء کے بعد فلسطینی علاقے سے واپس جانا تھا۔ تو پھر کیا ہوا؟ .....اس کی کچھ مختصر تفصیل یہاں بیان کرنا ضروری ہے کہ ''بالفور ڈیکلریشن'' (Balfour Declaration) کیا تھا؟

(4)بالفور ڈیکلریشن..... (Balfour Declaration)

''بالفور ڈیکلریشن'' (Balfour Declaration) ایک خط تھا جو 1917ء میں آرتھر بالفور (Arthur Balfour) نے لکھا تھا۔ آرتھر بالفور اُس وقت برطانوی سلطنت کے سیکریٹری خارجہ تھے۔ آرتھر بالفور نے اپنے اِس خط میں فلسطین میں ''یہودیوں کیلئے قومی گھر'' (National Home for the Jewish People) کے قیام کیلئے برطانوی حکومت کی حمایت کا اظہار کیا تھا اور 2 نومبر 1917ء کو یہ خط

آرتھر بالفور نے برطانوی یہودی کمیونٹی کے رہنماء لارڈ روتھ شائلڈ (Lord Rothschild) کے نام لکھا تھا۔ واضح رہے کہ برطانوی سیکریٹری خارجہ نے یہ خط پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے سے ایک سال پہلے یعنی 2 نومبر 1917ء کو لکھا تھا جبکہ پہلی جنگِ عظیم کا خاتمہ 11، نومبر 1918ء کو ہوا تھا۔ یہاں اِس بات کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے کہ آرتھر بالفور نے ''یہودی لوگوں کے لئے قومی گھر'' فلسطین کے جس علاقے میں قائم کرنے کا ذکر کیا تھا وہ چھوٹی اقلیتی یہودی آبادی والا عثمانی خطہ تھا۔ یہاں اِس امر کا ذکر کرنا نہ صرف ضروری ہے بلکہ انتہائی اہم بھی ہے کہ آرتھر بالفور (Arthur Balfour) کا یہی وہ خط تھا جو اسرائیل کی ریاست کے قیام کا سبب بنا جو 14 مئی 1948ء کو قائم کی گئی۔

(5) اب قارئین غور کریں کہ 29 نومبر 1947ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اپنی ایک قرارداد 181 (جسے تقسیمِ فلسطین کی قرارداد بھی کہا جاسکتا ہے) پاس کی۔ اس 181 قرارداد کے تحت فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کرکے اسے ''عرب'' اور ''یہودی'' ریاستوں میں تقسیم کرنا مقصود تھا اور فلسطین کا وہ حصہ جسے یروشلم (Jerusalem) کہا جاتا ہے اسے 181 کی قرارداد میں ''کورپس سیپارٹم (Corpus Separtum) یعنی علیحدہ وجود والا علاقہ (Seperate Entity) قرار دیا گیا تھا جو خصوصی بین الاقوامی حکومت کے ماتحت ہوگا۔

اِس طرح فلسطین کو دو علیحدہ علیحدہ ریاستوں میں یعنی عرب اور یہودی ریاستوں میں تقسیم کردیا گیا اور یروشلم (Jerusalem) کو ایسا حصہ قرار دیا گیا جو بین الاقوامی حکومت کے ماتحت ہوگا، اور بالآخر 14 مئی 1948ء کو ریاستِ اسرائیل کا باقاعدہ قیام عمل میں لایا گیا۔

(6) اقوام متحدہ میں شامل 50 سے زائد ممالک نے ریاستِ اسرائیل کے قیام کو تسلیم کرلیا۔

اب میں قارئینِ کرام کے سامنے کچھ ایسے حقائق بیان کرنا چاہوں گا جنہیں پڑھ کر شاید آپ کو یہ محسوس ہو کہ وہ بیان کردہ حقائق سوالات کی شکل میں آپ سے پوچھے جارہے ہیں۔ لیکن اُن حقائق کو اِس طرح ضبطِ تحریر میں لانا اِس لئے بھی ضروری ہے کہ ہر فرد اُس پر غور وفکر کرلے اور بیان کردہ حقائق کے درست یا غلط ہونے کا اندازہ کرسکے، یا میرے بیان کردہ حقائق میں مزید اِصلاح کا کوئی اور نیا پہلو سامنے لے آئے۔ لہٰذا اب میں

اپنی تحریر کو مزید آگے بڑھاتا ہوں کہ میں اب تک کے بیان کردہ تاریخی حقائق کی روشنی میں ایک اہم تاریخی بات لکھنا بھول گیا تھا جسے میں یہاں بیان کرتا ہوں کہ،

(7) فلسطین پر 1918ء تک سلطنتِ عثمانیہ کی حکومت قائم تھی۔ مزید وضاحت اس بارے میں یہ ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ کے تُرک قبائلیوں (Turkic Tribesmen) نے 1517ء میں پورے فلسطین پر سلطنتِ عثمانیہ کا جھنڈا لہرا دیا تھا۔ تُرک قبائل، فلسطین میں 1918ء تک یعنی 402 سال تک موجود رہے۔

(8) 1918ء سے لے کر 1948ء یعنی 30 سال تک فلسطین پر سلطنتِ برطانیہ کا قبضہ رہا۔

(9) بالفور ڈیکلریشن میں سلطنتِ برطانیہ کے سیکریٹری خارجہ آرتھر بالفور نے 2 نومبر 1917ء کو جو خط برطانوی یہودی کمیونٹی کے رہنماء لارڈ روتھ شائلڈ (Lord Rothschild) کو لکھا تھا اس میں اُنہیں فلسطین میں ''یہودیوں کے قومی گھر'' بنانے کا یقین دلایا گیا تھا۔ 29 نومبر 1947ء کو اقوامِ متحدہ نے ایک قرارداد 181 کے تحت فلسطین کو دو ریاستوں یعنی عرب اور یہودی ریاستوں میں تقسیم کر دیا تھا جس کے بعد 14 مئی 1948ء کو ریاستِ اسرائیل کا قیام عمل میں لایا گیا۔

(10) اقوامِ متحدہ کی قرارداد 181 نے نہ صرف فلسطین کے علاقے میں ریاستِ اسرائیل قائم کی بلکہ فلسطین کی قدیم جغرافیائی حیثیت کو ختم کر کے فلسطینی علاقوں کو عرب ریاستوں میں بھی شامل کر دیا۔

(11) کیا آپ نہیں سمجھتے کہ اِس طرح اقوام متحدہ نے فلسطین پر صدیوں سے آباد فلسطینی عوام کے بنیادی انسانی حقوق کو سرے سے پسِ پشت ڈال دیا تھا؟

مزید حقائق:

(12) اب میں ریاستِ اسرائیل کے قیام جو 14 مئی 1948ء کو قائم کی گئی تھی، کے بارے میں کچھ مزید نکات اٹھانا چاہوں گا۔

فلسطین کا علاقہ کتنا قدیم علاقہ (خطہ) ہے اِس کی تفصیلات میں اپنی تحریر میں پہلے ہی خاصی تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ جہاں کہیں کوئی علاقہ (خطہ) ہوگا وہاں انسانوں کے وجود سے انکار ممکن نہیں اور اگر انسان کا وجود کسی علاقے

یا خطے میں ناممکن ہو تو بھی وہاں حشرات الارض میں سے کسی کا وجود تو لازماً ہوگا۔ اِسی اصول کے مطابق فلسطین ایک بہت ہی قدیم خطہ ہے جہاں پر صدیوں سے رہنے والے لوگ اپنے آپ کو فلسطین سے ہی منسوب کریں گے اور یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ پوری دنیا میں رہنے والے انسان اپنے آپ کو اپنے آباؤ اجداد کے علاقے (خطے) سے ہی منسوب کرتے ہیں۔ لہٰذا فلسطین میں رہنے والوں نے اقوام متحدہ کی قرارداد 181 کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے اپنے وطن فلسطین کو آزاد کرانے کی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ اس طرح 14 مئی 1948ء کے بعد سے اسرائیل اور فلسطین کے درمیان تنازعے کا آغاز ہوا جسے دیرینہ تنازع کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے اپنی تحریر میں پہلے بیان کیا ہے کہ فلسطین کے عوام نے تقسیمِ فلسطین کو تسلیم نہیں کیا تھا لہٰذا انہوں نے خطۂ فلسطین میں ہی رہتے ہوئے آزادی اور صرف آزادی کی جدوجہد شروع کر دی جو آج تک جاری ہے۔

اب مزید آگے چلتے ہیں کہ 14 مئی 1948ء میں ریاستِ اسرائیل کے قیام کے بعد سے آج 2023ء تک کیا کیا ہوتا رہا ہے، اُس بابت کچھ باتیں کریں گے۔

(13) کیا یہ بات درست نہیں کہ جب 14 مئی 1948ء کو ریاستِ اسرائیل کے قیام کا باقاعدہ اعلان کیا گیا تھا تو اسرائیل نے طاقت کا بے دریغ استعمال کر کے سرزمینِ فلسطین کے باقی رہ جانے والے وہ علاقے جنہیں اقوام متحدہ کی قرارداد 181 کے تحت عرب ریاستوں کا حصہ بنایا گیا تھا اُن میں سے بہت سے علاقوں پر اسرائیل نے قبضہ کر لیا تھا اور وہاں رہنے والے ہزاروں فلسطینیوں کو اُن کے گھروں سے بے دخل کر دیا تھا؟

آج بھی اُن علاقوں پر اسرائیل کا قبضہ برقرار ہے لیکن افسوس کہ اقوامِ متحدہ نے اپنی منظور کردہ 181 قرارداد کی خلاف ورزی کرنے پر نہ تو قبضہ کیے گئے فلسطینی علاقوں کو خالی کرانے کیلئے کوئی اقدام کیا اور نہ ہی اسرائیل کے خلاف کوئی ایکشن لیا۔

(14) اسرائیلی ریاست کی افواج کے حملوں کا یہ سلسلہ جاری رہا اور مزید سے مزید فلسطینی علاقوں پر قبضے کیے جاتے رہے۔ اسرائیلی افواج کے حملوں میں ہر گزرتے دن کے ساتھ نہ صرف اضافہ ہوتا رہا بلکہ اسرائیل نے اپنے حملوں میں بندوقوں اور چھوٹے ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ گولہ بارود سمیت ٹینکوں کا استعمال بھی کرنا شروع کر دیا۔ پوری دنیا شاہد ہے کہ اسرائیلی افواج جب جب اور جس جس فلسطینی علاقے پر حملے کرتیں تو اُن علاقوں

میں رہنے والے فلسطینی عوام اور نوجوان پتھروں اور غلیلوں سے اُن کا مقابلہ کرتے تھے مگر غلیلوں سے جدید ترین بندوقوں اور بھاری ہتھیاروں کا مقابلہ کس طرح اور کتنی دیر تک کیا جا سکتا ہے لہٰذا بالآخر فلسطینی عوام کے پاس اُن علاقوں کو خالی کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ باقی نہ رہتا تھا۔ اسرائیل کے اِن حملوں کی وجہ سے بڑی تعداد میں فلسطینی عوام ہلاک وزخمی ہوتے تھے اور فلسطینی عوام کو اپنے وہ علاقے چھوڑنے پڑتے تھے جن پر اسرائیلی افواج قبضے کر کے اُن علاقوں پر اسرائیل کے لوگوں کی آبادکاریاں کراتی تھیں۔

اس سے پہلے کہ میں اسرائیل فلسطین تنازعے کی تاریخ کے بارے میں اپنے تحقیقی مقالے کو مزید آگے بڑھاؤں، یہاں میں اُن اہم شخصیات کی تصاویر پیش کرنا چاہوں گا جن کی خط وکتابت کے نتیجے میں فلسطین کے علاقے میں یہودیوں کے علیحدہ ''قومی گھر'' بنانے کی تجویز کے بعد ہی سلطنتِ برطانیہ نے اسرائیل کے قیام کیلئے اپنی کوششوں کو ہرگزرتے دن کے ساتھ تیز سے تیز تر کر دیا تھا۔ اُن اہم شخصیات میں ایک طرف آرتھر بالفور (Arthur Balfour) کی تصویر ہے جبکہ دوسری طرف لارڈ روتھشائلڈ (Lord Rothschild) کی تصویر ہے۔

(آرتھر بالفور کی تصویر اور لارڈ روتھشائلڈ کی تصویر مقالے کے آخری صفحات پر ملاحظہ کیجئے۔)

اِس کے علاوہ میں دو عدد نقشوں (Maps) کے عکس بھی قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں کہ 1917ء میں فلسطین کے علاقے میں یہودیوں کی آبادی کتنی تھی جسے بلیو کلر میں اور غیر یہودیوں بشمول مسلمانوں کی کتنی آبادی تھی جسے گرین کلر میں دکھایا گیا ہے۔

اسی طرح ایک نقشہ 1918ء سے 1947ء کا بھی ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کی کتنی آبادی بڑھی۔ یہ نقشہ جات مقالے کے آخری صفحات پر ملاحظہ کیجئے۔

قارئین کرام!

یہاں غور کریں کہ 1917ء کا جو پہلا نقشہ ہے وہ اُس وقت کا ہے جب اسرائیل کی باقاعدہ ریاست قائم نہیں ہوئی تھی اور جس کا قیام 14 مئی 1948ء کو عمل میں لایا گیا تھا۔

تاریخ مزید یہ بتاتی ہے کہ 1918ء میں پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر جب سلطنتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہوا تو لیگ آف نیشنز (League of Nations) نے 1922ء میں فلسطین کو سلطنتِ برطانیہ کے مکمل کنٹرول میں دے دیا، جب فلسطین پر برطانیہ کا کنٹرول ہوا تو 14 مئی 1948ء سے پہلے یعنی اسرائیل کی علیحدہ ریاست کے قیام کے اعلان سے پہلے فلسطین میں یہودیوں کی آبادی 1918ء سے 1947ء تک 6 فیصد سے بڑھ کر 33 فیصد ہوگئی۔

پہلی اسرائیل۔عرب جنگ 1948ء.....(First Israel-Arab War 1948)

1948ء میں اسرائیل کی ریاست بن جانے کے بعد پہلی اسرائیل ۔عرب جنگ کا آغاز ہوا جس میں اسرائیل کی فوج کو عرب ریاستوں کی افواج پر سبقت حاصل ہوئی اور اسرائیلی افواج نے تاریخی فلسطین کے 78 فیصد حصے پر قبضہ کرلیا۔اس قبضے کی وجہ سے لاکھوں فلسطینیوں میں سے تین چوتھائی فلسطینی آبادی کو اُن کے گھروں سے جبری بے دخل کردیا گیا اور یہ بے دخل خاندان غزہ (Gaza) اور مغربی کنارے (West Bank) پر آباد ہونے پر مجبور ہوئے۔

14 مئی 1948ء کو اسرائیل کی ریاست کے قیام کے بعد اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان جنگوں سمیت کئی تنازعات رونما ہوئے۔ بڑی جنگوں میں 1948ء میں اسرائیل اور عرب جنگ، 1956ء میں سوئز کینال کا بحران، 1967ء میں چھ روزہ جنگ، 1967ء سے 1970ء تک جنگ بندی، یعنی دونوں (اسرائیل اور عرب) جنگ بند کرانے یعنی مزید یہ کہ جنگ کو کیسے کم سے کم کیا جائے یا ختم کیا جائے، اُس کے لئے 1967ء سے 1970ء تک چھوٹی بڑی جنگیں ہوتی رہیں۔

یوم کپور جنگ 1973ء..... (Yom Kippur War in 1973)

1973ء میں ''یوم کپور'' (Yom Kippur) جنگ ہوئی۔ یوم کپور جنگ اُس جنگ کو کہا جاتا ہے جو 6، اکتوبر 1973ء کو اسرائیل اور عرب ممالک خصوصاً مصر (Egypt) اور شام (Syria) کے درمیان لڑی گئی۔

مزید وضاحت: اُس جنگ کو ''اکتوبر جنگ'' یا ''رمضان جنگ'' (Ramadan War) بھی کہا جاتا ہے۔ اِس جنگ کا آغاز یہودیوں کے مقدس دن ''یومِ کپور'' کو ہوا تھا۔

6، اکتوبر 1973ء کو ''یومِ کپور'' کے دن عرب اتحاد نے یہ جنگ شروع کی تا کہ اسرائیل کے قبضہ کئے گئے اُن علاقوں کو اسرائیل سے واپس لیا جائے جن پر اسرائیل نے 1967ء کی چھ روزہ جنگ کے دوران قبضے کئے تھے۔ اس طرح عرب اتحاد کی فوجیں، سوئز کینال پار کر کے سینائی پینسولا (Sinai Peninsula) میں داخل ہوئیں۔

اِس پر ابتدائی طور پر اسرائیل پریشان تو ضرور ہوا مگر اُس نے اپنے آپ کو دوبارہ منظّم کیا اور دوبارہ حملہ کر کے عرب اتحاد کی فوجوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ یہ جنگ تقریباً تین ہفتوں تک جاری رہی اور بالآخر جنگ بندی پر ختم ہوئی۔ اس کے بعد 1982ء میں اسرائیل اور لبنان کے درمیان جنگ ہوئی۔

اب میرے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا ہے کہ جس طرح اسرائیل کی باقاعدہ فوج ہے تو کیا اُسی طرح فلسطین کی بھی کوئی فوج تھی یا ہے؟ تحقیق کے نتیجے میں جو باتیں سامنے آئیں اُن باتوں سے میں یہاں نوجوان نسل، طلباء وطالبات اور قارئینِ کرام کو آگاہ کرنا چاہوں گا کہ اسرائیل کی طرح فلسطین کی کوئی باقاعدہ روایتی فوج نہیں تھی تاہم فلسطین پر اسرائیل کے قبضے کے بعد فلسطین کی آزادی کیلئے فلسطینی کاز سے وابستہ مسلح گروہ اور فوجی دستے ضرور قائم ہوتے رہے ہیں، جیسے فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (PLO) اور اُس کا مسلح ونگ اور فلسطین لبریشن آرمی (PLA)۔ یہ وہ گروہ ہیں جو مسلح مزاحمت، گوریلا جنگ اور دیگر قسم کی فوجی سرگرمیوں میں مصروف ہیں

یہاں یہ بتانا بہت ضروری ہے کہ صورتحال بہت پیچیدہ ہے، اِس تنازعے میں بہت سے دیگر چند چھوٹے بڑے بین الاقوامی ممالک بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ شامل ہو چکے ہیں۔ مزید ایک سوال یہاں اور پیدا ہوتا ہے کہ فلسطین نے کیا کبھی اسرائیل پر فضائی حملے کیے ہیں؟ تو اِس کا جواب انتہائی سادہ اور آسان ہے کہ نہیں ہرگز نہیں کیونکہ فلسطین کے پاس فضائیہ (Air Force) کا وجود ہی نہیں پایا جاتا تو وہ اسرائیل پر فضائی حملہ کیسے کر سکتا ہے؟ دوسری طرف اسرائیل کے پاس خطے میں جدید ترین فضائی افواج ہیں جو ٹیکنالوجی کے لحاظ سے دنیا کے ترقی یافتہ ممالک سے زیادہ یا برابر کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اسرائیل نے خطے میں متعدد مرتبہ فضائی حملے کیے ہیں۔

اب یہاں ایک اور سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا فلسطین کے پاس بھاری توپ خانہ (Heavy Artilery)، ٹینکس (Tanks) کی صلاحیت موجود ہے؟ تو اِس کا جواب بھی یہ ہے کہ نہیں ہرگز نہیں۔ ایک مقبوضہ علاقے کے طور پر فلسطین کے پاس نہ تو بھاری توپ خانہ ہے نہ ہی ٹینکس ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اُسے اِس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ فلسطین کے پاس اسرائیل جیسی فوجی صلاحیتیں نہیں ہیں جبکہ دوسری جانب اسرائیل کے پاس ایک باقاعدہ فوج کے ساتھ ساتھ ٹینکس، بکتر بند گاڑیاں (Armored Vehicles) اور بھاری توپ خانے (Heavy Artilery) سمیت فوجی ساز وسامان کی ایک وسیع رینج موجود ہے۔

سوال کے سوال ذہن میں آرہے ہیں کہ ایک اصطلاح بین الاقوامی اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا میں بہت سننے کو ملتی رہی ہے اور وہ اصطلاح ''سیٹلرز'' (Settlers) کی ہے۔ تو ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ سیٹلرز (Settlers) کے معنی کیا ہیں اور یہ اصطلاح اُس خطہ میں کن لوگوں کیلئے استعمال کی جاتی ہے؟ تحقیق کے مطابق سیٹلرز کے معنی ''آبادکار'' کے ہیں اور آبادکار کی اصطلاح اُن اسرائیلی شہریوں کیلئے استعمال ہوتی ہے جنہیں مشرقی یروشلم سمیت مغربی کنارے (West Bank) کے مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں کمیونیٹیز کے نام پر قائم کی گئی ناجائز بستیوں میں لاکر آباد کیا گیا۔ یہ برسوں سے آباد فلسطینیوں کے وہ علاقے تھے جہاں سے فلسطینیوں کو طاقت کے ذریعے بے دخل کیا گیا تھا۔ یہودی آبادکاروں کی یہ بستیاں بین الاقوامی قوانین کے تحت غیر قانونی تصور کی جاتی ہیں۔

لکھتے لکھتے ایک اور سوال ذہن میں آیا کہ اسرائیلی افواج نے کتنی بڑی تعداد میں فلسطینیوں کو طاقت کے زور پر، جبری طور پر اُن کے علاقوں پر قبضہ کر کے اُنہیں ان کے بسے بسائے گھروں سے بے دخل کیا؟ تحقیق کے جواب میں جو کچھ مل سکا اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسرائیل۔ فلسطین تنازعہ کے نتیجے میں گزشتہ 75 برسوں میں فلسطینیوں کو بہت ہی بڑی تعداد میں نقل مکانی پر مجبور کیا گیا۔ فلسطینیوں کی ان کی برسوں سے آباد بستیوں سے جبری بے دخلی کا سلسلہ 14 مئی 1948ء کو ریاستِ اسرائیل کے قیام کے بعد سے ہی شروع نہیں ہوا بلکہ فلسطینیوں کی جبری بیدخلی کا یہ سلسلہ 1917ء سے ہی شروع ہوگیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ 2، نومبر 1917ء کو برطانیہ کے سیکریٹری خارجہ آرتھر بالفور (Arthur Balfour) نے برطانیہ میں یہودی کمیونٹی کے بااثر رہنماء لارڈ

روتھشائلڈ(Lord Rothschild) کو جنگِ عظیم اوّل کے اختتام سے ایک سال قبل ایک خط لکھا تھا۔اُس وقت سلطنتِ برطانیہ کے بادشاہ جارج پنجم تھے جن کا پورا نام George Frederick Ernest Albert تھا، جبکہ جنگِ عظیم اوّل 11، نومبر 1918ء کو ختم ہوئی تھی ۔اُس وقت سلطنتِ برطانیہ نے سلطنتِ عثمانیہ کے تُرک قبائل کو شکست سے دوچار کر کے فلسطین پر قبضہ کر لیا تھا۔آرتھر بالفور (Arthur Balfour) نے لارڈ روتھشائلڈ(Lord Rothschild) کے نام اپنے خط میں دنیا بھر میں مقیم یہودیوں کیلئے فلسطین میں ''قومی گھر'' تعمیر کرنے کی تجویز دیتے ہوئے لکھا تھا کہ ''برطانوی حکومت کی جانب سے میں، آپ کو صیہونی یہودیوں کی حمایت میں یہ بیان بھجوا رہا ہوں جو کابینہ کے سامنے رکھا گیا اور اِس کی منظوری دی گئی''۔اِس کا واضح مطلب یہ تھا کہ فلسطین کے عوام کو اُن کے قدیم وطن سے جبری بیدخل کر دیا جائے اور وہاں یہودی کمیونٹی کو بسایا جائے۔

فلسطین پر سلطنتِ برطانیہ کے قبضے کے بعد لیگ آف نیشنز (League of Nations) نے 1920ء میں برٹش مینڈیٹ کے تحت سلطنتِ برطانیہ کو فلسطین کا مکمل کنٹرول سنبھالنے کی باقاعدہ اجازت دے دی۔1920ء سے 1948ء تک یعنی 28 برسوں تک فلسطین پر برطانیہ کا مکمل قبضہ رہا اور اِس عرصے کے دوران فلسطین کے مقبوضہ علاقوں سے فلسطینی عوام کو اُن کی قدیم بستیوں سے نہ صرف جبری بیدخل کیا جاتا رہا بلکہ ''آبادکاری'' اور اسرائیلی ریاست کے قیام کے منصوبے کے تحت دنیا بھر کے یہودیوں کو فلسطین میں بسانے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا تھا۔

1920ء سے 1948ء تک یعنی 28 برسوں میں برطانوی سلطنت کے اِس دورانیہ میں یہودیوں کی آبادکاریوں میں اور زیادہ اضافہ اس لئے بھی ہونے لگا کہ برطانیہ کو ''برٹش مینڈیٹ'' کے تحت لیگ آف نیشنز (League of Nations) نے پورے خطہءعرب کو کنٹرول کرنے کا اختیار دے دیا تھا۔

برٹش مینڈیٹ.....(British Mandate)

The British mandate refers to a legal arrangement by the League of Nations (later known as the United Nations) in the aftermath of First World War, it granted Britain the administration and control over territories in the Middle East, which were previously part of the defeated Ottoman Empire. These territories included Palestine (which later became Israel and Palestine territories), Trans Jordan (which later became Jordan) and Iraq. The British Mandate aimed to establish a temporary rule and facilitate the development of self-governance in these territories.

نکبہ 1948.....(Nakba 1948)

1948ء کی عرب۔اسرائیل جنگ (جسے آزادی کی جنگ بھی کہا جاتا ہے) کے دوران لاکھوں فلسطینی بے گھر ہو گئے تھے۔ یہ جنگ اسرائیل کی ریاست کے قیام کے بعد ہوئی۔ اِس جنگ کے دوران لاکھوں کی تعداد میں فلسطینیوں کی اِس نقل مکانی کو فلسطینی عوام ''نکبہ'' (Nakba) کہتے ہیں۔ ''نکبہ'' (Nakba) عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ''تباہی'' (Catastrophe) ہے۔ اِس نکبہ (Nakba) کے بعد اسرائیل مزید فلسطینی علاقوں پر آہستہ آہستہ حملے کر کے وہاں قبضے کرتا رہا اور وہاں یہودیوں کی آبادکاری بھی کرتا رہا جس کی وجہ سے مزید لاکھوں فلسطینیوں کو نقل مکانی کرنی پڑی۔ فلسطینیوں کی اِس جبری بیدخلی کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

سوئز کینال کا مختصر تاریخی جائزہ .....(A brief history of The Suez Canal)

1956ء کا سوئز کینال بحران (Suez Canal Crisis) ایک بہت بڑا بین الاقوامی واقعہ تھا لیکن

اس سے پہلے کہ میں 1956ء کے سوئز بحران کی تفصیلات پر روشنی ڈالوں، ہم سوئز کینال کی تاریخ کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں تا کہ قارئین سوئز کینال کی تاریخ اور اُس کی جغرافیائی اہمیت سے آگاہ ہوسکیں۔

نہر سوئز یا سوئز کینال ایک اہم آبی گزرگاہ ہے، نہر سوئز جہاں واقع ہے وہ علاقہ صدیوں سے مصر (Egypt) کا حصہ رہا ہے۔ 1517ء تک مصر پر سلطنتِ مملوک کی حکومت تھی۔ 1517ء میں سلطنتِ عثمانیہ کی افواج نے سلطنتِ مملوک کو شکست دے کر مصر پر قبضہ کرلیا اور مصر کو سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ بنالیا۔ 1882ء میں سلطنتِ برطانیہ نے مصر پر قبضہ کر کے اُسے اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ مصر پر سلطنتِ برطانیہ کا کنٹرول 1952ء تک برقرار رہا۔ 23 جولائی 1952ء کو مصر نے برطانوی سلطنت سے آزادی حاصل کی۔

اس بات کو مزید سمجھنے کی ضرورت ہے کہ چاہے سلطنتِ مملوک ہو، سلطنتِ عثمانیہ ہو یا سلطنتِ برطانیہ کی حکومت ہو، نہر سوئز کا خطہ ہمیشہ سے مصر کے جغرافیے میں شامل رہا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ نہر سوئز خطہء مصر سے منسلک رہی یا اُس کا حصہ رہی۔ یہ گزرگاہ انگریزوں کے ساتھ ساتھ فرانسیسیوں کے کنٹرول میں بھی رہی۔ نہر سوئز مصر کے لئے انتہائی اہمیت رکھنے والی نہر ہے۔ اس نہر سوئز کی اہمیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ سوئز کینال بحیرہء روم (Mediterranean Sea) کو بحیرہء احمر (Red Sea) سے ملانے والی نہر ہے جو یورپ اور ایشیاء کے درمیان سمندری تجارت کے لئے ایک شارٹ کٹ فراہم کرتی ہے۔ یہ نہر بین الاقوامی تجارت اور نقل وحمل کیلئے اہم آبی گزرگاہ تھی۔ نہر سوئز سونے چاندی اور ہیرے جواہرات سے مالا مال نہر بھی قرار دی جاتی ہے۔ انہی اسباب کے تحت نہر سوئز (Suez Canal) دنیا بھر کی سلطنتوں اور موجودہ زمانے کے چند ترقی یافتہ اور امیر ترین ممالک کی خصوصی توجہ کا مرکز رہی۔

سوئز کینال بحران..... (The Suez Canal Crisis)

سوئز کینال بحران اُس وقت پیش آیا جب سلطنتِ برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے کے بعد مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے نہر سوئز کو قومیالیا یعنی اسے Nationalized کرلیا۔ سوئز کینال کے قومیائے جانے کے اِس اقدام کے جواب میں برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے ایک خفیہ اتحاد قائم کیا۔ اِس خفیہ اتحاد کا مقصد نہر سوئز پر

دوبارہ کنٹرول حاصل کرنا اور صدر جمال عبدالناصر کو اقتدار سے ہٹانا تھا۔ اِسی مقصد کے تحت اکتوبر 1956ء میں اسرائیل نے برطانیہ اور فرانس کے تعاون سے مصر پر زبردست حملہ کر دیا۔ تاہم برطانیہ، فرانس اور اسرائیل پر مشتمل اِس اتحاد کے اِن اقدامات کی بین الاقوامی سطح پر شدید مذمت ہوئی خاص طور پر امریکہ اور سوویت یونین کی طرف سے شدید احتجاج پر اقوامِ متحدہ نے سوئز کینال بحران کے معاملے پر مداخلت کی اور فوری طور پر جنگ بندی کا مطالبہ کیا۔ اِس عالمی دباؤ کے نتیجے میں برطانوی، فرانسیسی اور اسرائیلی افواج کو علاقے سے نکلنا پڑا۔ تین رکنی اتحاد کی افواج کے انخلاء کے نتیجے میں اِس سوئز کینال بحران نے مشرقِ وسطیٰ میں طاقت کا توازن اِس طرح بدلا کہ اُس خطے پر برطانوی اور فرانسیسی اثر ورسوخ کم ہوا جبکہ بڑے کھلاڑیوں امریکہ اور سوویت یونین کے اثر ورسوخ میں اضافہ ہوا۔

1956ء کے سوئز بحران کے بعد اسرائیل نے کئی ایسے علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا جو پہلے عرب ممالک اور فلسطین کے زیرِ کنٹرول تھے۔ خاص طور پر اسرائیل نے جزیرہ نما سینائی پر قبضہ کر لیا جو مصر کے کنٹرول میں تھا اور غزہ کا علاقہ جو اُس وقت مصر کے زیرِ انتظام تھا۔ اسرائیل نے مشرقی یروشلم سمیت مغربی کنارے پر بھی قبضہ کر لیا جو جنگ سے قبل اُردن کے کنٹرول میں تھا۔ یہ قابلِ غور بات ہے کہ خطے کی صورتحال وقت کے ساتھ ساتھ بدلی ہے اور اُس کے بعد تنازعات اور علاقائی کنٹرول میں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ علاوہ ازیں اُس خطے کے نقشے میں آہستہ آہستہ ریاستِ اسرائیل کا رقبہ مزید سے مزید تر بڑھتا رہا جبکہ فلسطین کا وہ رقبہ جو اسرائیلی ریاست کے قیام سے پہلے تھا وہ رقبہ کم سے کم تر ہوتا رہا۔

بحیرہ ءاحمر..... (Red Sea)

1967ء کی عرب۔ اسرائیل جنگ کی تفصیلات پر روشنی ڈالنے سے پہلے میں اُن وجوہات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو 1967ء میں عرب۔ اسرائیل جنگ کا سبب بنیں۔

نئی نسل کے نوجوانوں، طلباء وطالبات اور قارئین کو بتاتا چلوں کہ بحیرہ ءاحمر (Red Sea) کسے کہتے ہیں۔ بحیرہ ءاحمر افریقہ اور ایشاء کے براعظموں کے درمیان واقع پانی کا ایک جسم ہے۔ یہ اپنے جنوبی سرے پر

بحیرہ ءہند سے جُڑا ہوا ہے اور اس کی سرحدیں مصر، سوڈان، سعودی عرب، یمن اور اُردن جیسے ممالک سے ملتی ہیں۔

آبنائے تیران کی ناکہ بندی.....مئی 1967ء:

(Blockade of the straits of Tiran in May 1967)

آبنائے تیران بحیرہ ءاحمر (Red Sea) میں واقع پانی کا ایک تنگ راستہ ہے جسے ''آبنائے تیران'' کہتے ہیں۔ مزید وضاحت یہ کہ اس علاقے، خاص طور پر جزیرہ نما سینائی (Sinai Peninsula) اور جزیرہ تیران (The Tiran Island) کے درمیان کے علاقے کو ''آبنائے تیران'' کہتے ہیں اور یہ وہ سمندری راستہ ہے جو خلیج عقبہ (The Gulf of Aqaba) کو بحیرہ ءاحمر سے ملاتا ہے۔ اسرائیل اپنی جہاز رانی کے لئے آبنائے تیران کو استعمال کرتا تھا۔

ہوا یوں کہ ماہ مئی 1967ء میں مصر (Egypt) نے آبنائے تیران کو اسرائیلی جہاز رانی کیلئے بند کر دیا۔ اِس ناکہ بندی کو اسرائیل نے اپنی سلامتی کیلئے خطرہ سمجھا چنانچہ اسرائیل نے آبنائے تیران کی ناکہ بندی کے خاتمے کے لئے اپنی افواج کو متحرک کرنا شروع کر دیا اور یوں اِس تنازعے کے نتیجے میں آبنائے تیران کی ناکہ بندی 1967ء کی عرب-اسرائیل جنگ کا سبب بنی۔ اس جنگ کو ''1967ء کی جنگ'' بھی کہا جاتا ہے جو اسرائیل اور عرب ریاستوں کے اُس اتحاد کے درمیان ہوئی جس میں مصر، اُردن اور شام سمیت دیگر عرب ریاستیں شامل تھیں۔

عرب-اسرائیل جنگ جون 1967ء.....(Arab-Israel War: June 1967)

1948ء میں اسرائیل کی باقاعدہ ریاست کے قیام کے بعد اسرائیل اور عرب ریاستوں کے درمیان تناؤ میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا۔ بالآخر 1967ء میں اسرائیل اور عرب ممالک کے درمیان ایک ایسی جنگ ہوئی جس نے مشرقِ وسطیٰ کا علاقائی نقشہ تبدیل کر دیا اور جو آج تک اسرائیل اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کے درمیان علاقائی تنازعے اور کشیدگی کا اہم سبب ہے۔

1967ء کی عرب۔ اسرائیل جنگ کا آغاز 5، جون 1967ء کو ہوا اور یہ جنگ 10، جون 1967ء یعنی چھ روز تک جاری رہی۔ اس مناسبت سے اس جنگ کو ''چھ روزہ جنگ'' بھی کہا جاتا ہے۔ 1967ء کی اِس چھ روزہ جنگ میں ایک طرف اسرائیل تھا اور دوسری طرف مصر، اُردن، شام اور دیگر عرب ممالک تھے۔ اسرئیل ان تمام عرب ممالک کے خلاف اکیلا لڑ رہا تھا۔ اس جنگ میں بالآخر اسرائیل، عرب ممالک کے خلاف فاتح بن کر اُبھرا اور اِس جنگ میں اسرائیل نے بہت ساری فوجی کامیابیاں حاصل کیں اور ساتھ ساتھ علاقائی فوائد بھی حاصل کیے اسرائیل نے مصر سے جزیرہ نما سینائی (Sinai Peninsula) اور غزہ کی پٹی (Gaza strip)، اُردن سے مغربی علاقے (West Bank)، مشرقی یروشلم (East Jerusalem) اور شام سے گولان کی پہاڑیوں (Golan Heights) کے علاقوں کو فتح کر کے اُن پر قبضہ کر لیا۔ تاہم اِن مقبوضہ علاقوں میں سے اسرائیل نے 2005ء میں غزہ کی پٹی سے دستبرداری اختیار کر لی تھی۔

یہودی (Jews) اور صیہونی (Zionist) میں کیا فرق ہے؟

(Difference between Jews and Zionist)

یہودی.....(Jews)

یہودی (Jews) وہ افراد ہوتے ہیں جو یہودی مذہب، ثقافت یا نسل سے تعلق رکھتے ہیں، یہودی پوری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ یہودیت (Judaism) دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں سے ایک قدیم مذہب ہے جو ایک خدا (اللہ) پر یقین رکھتے ہیں۔

صیہونی.....(Zionist)

صیہونی (Zionist) اُن یہودیوں کو کہتے ہیں جو صیہونی نظریہ یا صیہونیت (Zionism) پر یقین رکھتے ہیں۔ جبکہ یہودی (Jews) اور صیہونی (Zionist) دونوں ہی گروپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر مانتے ہیں اور مقدس کتاب توریت (Tora) پر یقین رکھتے ہیں۔ لیکن Zionist یہودیوں کیلئے ایک علیحدہ وطن کا قیام

چاہتے تھے جو بن بھی چکا ہے اور اب اس میں مزید وسعت چاہتے ہیں۔ اسی توسیع پسندانہ سوچ بھی رکھتے ہیں اور اسی توسیع پسندانہ سوچ کو صیہونیت (Zionism) کہا جاتا ہے۔

صیہونی تحریک .....(Zionist Movement)

صیہونیت (Zionism) کیا ہے، اس کو میں مزید وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

صیہونی تحریک (Zionist Movement) ایک منظّم قوم پرست سیاسی تحریک ہے۔ جس کا مقصد ''فلسطین'' کے قدیم خطے یعنی علاقے میں ایک علیحدہ یہودی وطن کا قیام اور اس کا تحفظ کرنا ہے۔ صیہونی تحریک کا قیام 19 ویں صدی کے اواخر میں 1897ء میں عمل میں آیا تھا اور اس تحریک کی بنیاد تھیوڈور ہرزل (Theodor Herzl) نے رکھی تھی۔ تھیوڈور ہرزل ایک Austro-Hungarian یہودی سیاسی رہنما اور صحافی تھے جو مغربی یورپ کی سلطنت آسٹریا کے شہر بڈاپسٹ (Budapest) کے قصبے ''پیسٹ'' (Pest) کے ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔

تھیوڈور ہرزل نے 1896ء میں Der Judenstaat یہودیوں کی ریاستی یعنی (Jewish State) کے نام سے ایک مشہور پمفلٹ جاری کیا جس کے ذریعے اس نے ایک علیحدہ یہودی وطن کا نظریہ پیش کیا جو دنیا بھر میں آباد یہودیوں میں بہت مقبول ہوا۔ اگست 1897ء میں تھیوڈور ہرزل نے سوئٹزرلینڈ کے شہر بیسل (Basel) میں صیہونی تحریک (Zionist Movement) کی پہلی کانگریس منعقد کی جس میں مختلف ممالک سے یہودیوں نے شرکت کی۔ اس طرح یہاں سے یہودیوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کے قیام کے لئے ایک باقاعدہ صیہونی تحریک کا آغاز ہوگیا اور تھیوڈور ہرزل اس قوم پرست صیہونی تحریک کا پہلا صدر مقرر ہوا۔ اِس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ (Jewish) یعنی یہودیوں کو دنیا کے مختلف حصوں میں ہونے والے ظلم وستم اور تشدد سے نجات دلائی جائے اور یہودیوں کے لئے ایک ایسی علیحدہ اور مستقل ریاست قائم کی جائے جو تاریخی طور پر فلسطین کی زمین پر قائم ہو۔

اگرچہ فلسطین کے قدیم علاقے میں ایک علیحدہ یہودی ریاست کے قیام کی کوششیں صیہونی تحریک

(Zionist Movement) کے قیام سے پہلے سے جاری تھیں لیکن 1897ء میں صیہونی تحریک کے قیام کے بعد فلسطینی علاقے میں یہودی وطن کے قیام کی کوششیں اور زیادہ تیز ہوگئیں۔

اگرچہ صیہونی تحریک کو دنیا بھر میں رہنے والے بہت سے یہودیوں کی جانب سے یہودیوں کے ایک علیحدہ وطن بنانے کی حمایت حاصل ہے لیکن تمام کے تمام یہودی، صیہونیت (Zionism) کے تصور کے حامی نہیں ہیں یعنی تمام کے تمام یہودی، صیہونی تحریک کی حمایت نہیں کرتے۔

نئی نسل کے نوجوانوں، طلباء وطالبات اور قارئین کرام!

آپ سب ہی یقیناً اسرائیل اور فلسطین تنازعے کی تازہ ترین صورتحال سے واقف ہوں گے جس کی وجہ سے پوری دنیا میں فلسطین کے حق میں چھوٹے بڑے مظاہرے ہورہے ہیں اِن مظاہروں میں دنیا بھر میں رہنے والے یہودی افراد بھی شریک ہورہے ہیں۔ یہ وہ یہودی ہیں جو صیہونیت (Zionism) کے خلاف ہیں جبکہ وہ یہودی جو اسرائیل کی حمایت کررہے ہیں وہ صیہونیت (Zionism) کے حامی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میری اوپر بیان کردہ باتوں کو پڑھ کر یہودی افراد اور صیہونی یہودیوں کے درمیان جو فرق ہے اُسے آپ تمام قارئین اچھی طرح سمجھ چکے ہوں گے۔

قارئین کرام!

اب میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہوں گا کہ آپ جب میرے اس تحقیقی مقالے کو پڑھیں گے تو بہت سی اصطلاحات (Terminologies) اگر آپ کی سمجھ میں نہ آئیں تو آپ براہِ کرم گوگل، وکی پیڈیا یا پھر کسی لائبریری میں جاکر تاریخ کی کتابوں سے رجوع کرلیں تو پھر جو اصطلاح (Terminology) آپ کی سمجھ میں نہیں آئی ہے اُسے سمجھنے میں آپ کو آسانی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ میں آپ سے اب تک کی تحریر میں بیان کردہ باتوں کو مزید پڑھنے کی درخواست کروں، میں کچھ اور باتوں کو مختصر طور پر دوبارہ دہرانا چاہوں گا۔ وہ باتیں آپ کو شاید ناگوار لگیں مگر اُن کا دہرانا میری تحریر کردہ باتوں کو سمجھنے کیلئے معاون ومددگار ثابت ہوسکتا ہے۔

یہ سمجھنا ہر قاری کیلئے اِن باتوں کی مزید تحقیق کرنے میں شاید معاون و مددگار ثابت ہو لہٰذا میں اُنہیں دہرانا یعنی Revision کرنا ضروری سمجھتا ہوں اُس کیلئے درج ذیل باتوں کو غور سے پڑھنا اور سمجھنا ہوگا مثلاً 1917ء میں فلسطین کا رقبہ کتنے اسکوائر گز یا میٹر پر مشتمل تھا، اُس کو جاننے کیلئے آپ کو گوگل، وکی پیڈیا یا (AI) یعنی مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence) سے رجوع کرنا ہوگا۔

1917ء کے بعد جب 1918ء میں سلطنتِ عثمانیہ (Ottoman Empire) کا خاتمہ ہوا تو فلسطین کا کنٹرول سلطنتِ برطانیہ نے سنبھال لیا تھا۔ تو سلطنتِ برطانیہ نے 1922ء کے اوائل تک فلسطین کے کتنے رقبے پر یہودیوں کو مزید بسایا، یا فلسطین کے مزید کتنے علاقوں پر طاقت کے ذریعے قبضہ کر کے سلطنتِ برطانیہ نے وہاں مزید یہودیوں کو آباد کیا، یا اُن کی آبادکاریاں کرائیں؟ اِس بارے میں معلومات کے لئے بھی آپ کو "Google" یا "Wikipedia" سے رجوع کرنا ہوگا اور صرف اُس میں بیان کردہ تحریر ہی کو نہیں پڑھنا ہوگا بلکہ مزید وضاحت کے ساتھ سمجھنے کیلئے متعلقہ نقشہ جات کو بھی دیکھنا ہوگا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ لیگ آف نیشنز مینڈیٹ (League of Nations Mandate) کے تحت سلطنتِ برطانیہ کے فلسطین پر قبضے کو جائز قرار دینے کیلئے ایک لیگل راستہ 14، جولائی 1922ء کو دے دیا گیا جو 14، مئی 1948ء تک برقرار رہا اور اُسی دن یعنی 14، مئی 1948ء کو فلسطین کے علاقے پر ایک آزاد اسرائیلی ریاست قائم کر دی گئی۔

قارئینِ کرام!

اب آپ اس بات کی بھی تحقیق ضرور کریں کہ 1918ء سے 14، مئی 1948ء تک فلسطین کے کتنے مزید علاقوں پر قبضہ کر کے وہاں آبادکار (Settlers) کے نام پر یہودیوں کی آبادکاریاں کی گئیں۔ اِس کو جاننے کیلئے گوگل پر نقشے دیکھئے۔ میں یہاں صرف یہ بتانا چاہوں گا کہ 1918ء میں فلسطین میں یہودیوں کی آبادی محض 6 فیصد تھی جو 1947ء میں بڑھ کر 33 فیصد ہوگئی تھی۔ اسرائیل کی ریاست جو 14، مئی 1948ء کو قائم ہوئی تو پھر عرب۔اسرائیل جنگیں ہوئیں جن میں اسرائیلی افواج نے تاریخی فلسطین کے 78 فیصد حصے پر قبضہ کر لیا تھا۔

1967ء کی چھ روزہ جنگ کے دوران اسرائیل نے تقریباً تمام تاریخی فلسطین پر قبضہ کرلیا جس کی وجہ سے مزید 3 لاکھ (300,000) فلسطینیوں کو جبری بیدخل کردیا گیا جبکہ اس سے پہلے 1948ء میں ریاستِ اسرائیل کے قیام کے بعد 7 لاکھ 50 ہزار (750,000) سے لیکر 9 لاکھ (900,000) فلسطینی مردوں، عورتوں اور بچوں کو اُن کے آبائی وطن سے بیدخل کیا گیا تھا اور وہاں یا تو یہودیوں کو آباد کیا گیا یا باقی علاقوں کو مسمار کردیا گیا۔

قارئین کرام!

اب ہم آگے بڑھتے ہیں۔ میں نے اپنے اِس تحریر کردہ مقالے میں اسرائیل۔فلسطین تنازعے کے بارے میں یہ بتایا تھا کہ اسرائیل کی ریاست قائم ہوجانے کے بعد اسرائیل، فلسطین اور عرب ریاستوں کے درمیان چھوٹی بڑی جنگیں ہوتی رہیں۔ آیئے! ہم اُن کا ایک مرتبہ پھر سرسری جائزہ لیتے ہیں۔

14 مئی 1948ء سے 1982ء کے درمیان یہ تنازعات اسی طرح چلتے رہے اور چھوٹی بڑی جنگیں بھی ہوتی رہیں۔ 1948ء میں اسرائیلی ریاست قائم ہونے کے فوری بعد جو جنگیں ہوئیں ان بڑی جنگوں میں 1948ء کی عرب اسرائیل جنگ، 1956ء میں سوئز کینال کا بحران، 1967ء میں چھ روزہ جنگ، 1967ء سے 1970ء تک جنگ بندی کیلئے جنگ، 1973ء میں یومِ کپور جنگ اور 1982ء میں اسرائیل۔لبنان جنگ شامل ہے۔ جبکہ اِن بڑی جنگوں کے علاوہ کئی مزید چھوٹی جھڑپیں بھی چلتی رہیں۔

قارئین کرام!

اب میں آپ کے سامنے کچھ مزید تاریخی حقائق رکھنا چاہتا ہوں تاکہ آپ اُن کی تصدیق اور مزید معلومات حاصل کرنے کیلئے گوگل، وکی پیڈیا یا مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence) سے رجوع کرسکیں۔

تاریخی اوسلو معاہدہ ..... (Historical Oslo Accord)

اوسلو معاہدہ، جسے امن معاہدہ بھی کہا جاتا ہے جو 1990ء کی دہائی کے اوائل میں اسرائیل اور فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (PLO) کے درمیان طے پانے والے تاریخی معاہدوں کا ایک سلسلہ ہے۔

ان معاہدوں کا ایک ''مقصد'' اسرائیل۔فلسطین تنازعے کے درمیان امن مذاکرات کیلئے ایک فریم ورک تیار کرنا تھا جبکہ دوسرا ''مقصد'' اسرائیل اور فلسطین تنازعے کے حل کیلئے ایک روڈ میپ بھی قائم کرنا تھا۔یعنی امن مذاکرات کو جاری رکھنے کیلئے ایک فریم ورک اور اُن کے حل کیلئے ایک روڈ میپ بھی تیار کرنا تھا۔

فلسطین اور اسرائیل کے درمیان اِس معاہدے کے سلسلے میں مذاکرات کا آغاز ناروے (Norway) کے دارالحکومت اوسلو (Oslo) میں کیا گیا تھا اور ان مذاکرات کا اختتام 20، اگست 1993ء کو ہوا تھا۔اوسلو میں اس ابتدائی معاہدے کے روڈ میپ پر اتفاق کے بعد فلسطین اور اسرائیل کے نمائندوں نے امریکی اور روسی وزرائے خارجہ کی موجودگی میں دستخط کئے۔

اِس تاریخی اوسلو معاہدے پر باقاعدہ دستخط 13، ستمبر 1993ء کو امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی میں اُس وقت کے امریکی صدر بل کلنٹن کی موجودگی میں کیے گئے۔اِس معاہدے پر فلسطین کی جانب سے فلسطین لبریشن آرگنائزیشن کے چیئرمین یاسر عرفات (Yasser Arafat) اور اسرائیل کی جانب سے اسرائیلی وزیراعظم اسحٰق رابن (Yitzhak Rabin) نے دستخط کیے تھے۔

اوسلو معاہدہ دو حصوں پر مشتمل تھا۔ایک کو ''اصولوں کا اعلان'' (Declaration of Principles-DoP) کہا گیا جبکہ اِس کے بعد کا دوسرا معاہدہ ''عبوری معاہدہ'' (Interim Accord) قرار پایا جسے Oslo Accord 2 بھی کہتے ہیں۔

اصولوں کے اعلان (Declaration of Principles-DoP) کے مطابق اسرائیل فلسطین تنازعے کے حل اور خطے میں مستقل امن کے حصول کیلئے ایک لائحہ عمل کا خاکہ پیش کیا گیا تھا جس میں مغربی کنارے (West Bank) اور غزہ کی پٹی (Gaza Strip) میں ایک عبوری خودمختار ادارے کے طور پر فلسطین اتھارٹی کا قیام شامل تھا۔

عبوری معاہدہ یا Oslo Accord 2 پر 1995ء میں مصر کے ٹاؤن طابا (Taba) میں دستخط کیے گئے جس کے تحت یہ طے پایا گیا تھا کہ فلسطین کے وہ علاقے یعنی مغربی کنارے اور غزہ کے کچھ حصوں میں جہاں اسرائیل نے قبضہ کرلیا تھا وہاں سے اسرائیلی افواج کے انخلاء اور اُن علاقوں میں فلسطینی خودمختاری کے قیام اور پی ایل او (PLO) کی طرف سے اسرائیل کو تسلیم کرنے جیسے مسائل پر توجہ مبذول کرائی گئی تھی۔

اگرچہ اوسلو معاہدے کو امن کی جانب ایک اہم قدم کے طور پر دیکھا گیا اور اس معاہدے کی رُو سے پانچ سال کے لئے عبوری انتظام پر اتفاق کیا گیا تھا اور اس پانچ سالہ عبوری انتظام کے دور میں اس تنازعے کے اہم امور طے کرنے کے لئے مئی 1996ء تک حتمی مذاکرات ہونے تھے لیکن اس تنازعے کا حتمی حل آج تک ایک پیچیدہ مسئلہ بنا ہوا ہے۔

یہ بھی ایک لمحہ ءفکریہ ہے کہ جن رہنماؤں نے تاریخی اوسلو معاہدے کی تکمیل میں اپنا کردار ادا کیا اور اس پر دستخط کئے اُن میں سے اسرائیلی وزیراعظم اسحاق رابن کو 4، نومبر 1995ء کو اوسلو معاہدے کی حمایت میں نکلنے والی ریلی کے اختتام پر گولیاں مار کر قتل کر دیا گیا جبکہ فلسطینیوں کے رہنما اور فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (PLO) کے چیئرمین یاسر عرفات کو Radioactive metal پولونیم (Polonium) کا زہر دیا گیا جس کی وجہ سے ان کی طبیعت ہر گزرتے دن کے ساتھ خراب سے خراب تر ہوتی گئی اور بالآخر انہیں علاج کی غرض سے فرانس کے ایک اسپتال میں داخل کر دیا گیا جہاں وہ 11، نومبر 2004ء کو انتقال کر گئے۔

اسرائیل پر حماس کا راکٹ اٹیکس۔ 7، اکتوبر 2023ء

(Rocket Attacks on Israel by Hammas: 7th October 2023)

7، اکتوبر 2023ء کو حماس نے اسرائیل پر راکٹ اٹیکس کیے جس کے نتیجے میں اسرائیل کے فوجیوں سمیت 13 سو سے زائد مرد، خواتین اور معصوم بچے ہلاک اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ اس کے علاوہ بہت سے مکانات، چھوٹی بڑی عمارتوں سمیت دیگر اثاثہ جات تباہ ہوئے۔ دنیا بھر کے تمام ہی ممالک نے اِن حملوں کی نہ صرف مذمت کی بلکہ متاثرہ اسرائیلی عوام سے دلی تعزیت اور اظہار ہمدردی بھی کیا۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ

حماس کے اِس اقدام کو دنیا کی بڑی اکثریت نے پسند نہیں کیا اور ایک بڑی اکثریت نے حماس کے اِس حملے کی شدید مخالفت کی اور اس کے خلاف احتجاج بھی کیا۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حماس نے ہزاروں راکٹس اور پیرا گلائیڈرز (Para gliders) کہاں اور کس ملک سے حاصل کیے؟ ساتھ ساتھ مجھ سمیت ہر فرد یہ بھی سوچ رہا ہے کہ حماس نے راکٹ اٹیکس کرنے سے پہلے یہ بھی کیوں نہیں سوچا کہ اسرائیل پر اٹیکس کرنے کے بعد اُس کا پلان دوئم (B) اور پلان سوئم (C) کیا ہوگا؟ اور حماس اور اُس کے ساتھیوں نے یہ بھی کیوں نہیں سوچا کہ اسرائیل پر ان کے حملوں کے جواب میں اسرائیل کی فوجی کارروائیاں کیا کیا اور کس کس طرح کی ہونگیں جن کا خمیازہ معصوم و نہتے فلسطینی عوام کو کس کس طرح بھگتنا پڑ سکتا ہے۔

اسرائیل جس نے پہلے ہی فلسطین کے تقریباً تمام ہی علاقوں پر یا یوں کہہ لیجئے کہ 90 فیصد سے زائد رقبے پر وقفے وقفے سے بھاری ہتھیاروں، ٹینکوں اور فضائیہ سے حملے کر کے قبضہ کر لیا تھا جو یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ اسرائیل کو فلسطین پر ہر طرح سے جنگی برتری حاصل رہی ہے۔ اس کے علاوہ اسرائیل کو پوری دنیا کے بڑے، امیر اور طاقتور ترین ممالک کی ہر طرح کی حمایت حاصل رہی ہے۔ اس حمایت میں صرف سفارتی حمایت ہی شامل نہیں تھی بلکہ ہر طرح کی عسکری ساز و سامان کی مدد بھی شامل رہی جن میں جنگی بحری جہازوں، دُور تک مار کرنے والے میزائلز، جدید ترین بندوقیں اور دیگر ہتھیار شامل ہیں۔

اِس امر سے ہر شخص واقف ہے کہ اسرائیل کو جن بڑے، امیر اور طاقتور ترین ممالک کی مکمل اور ہر قسم کی سپورٹ حاصل رہی ہے اُن ممالک میں امریکہ، برطانیہ سمیت تقریباً تمام مغربی ممالک شامل ہیں جبکہ فلسطین کو اِس طرح کی سپورٹ کسی بھی ملک کی حاصل نہیں تھی۔ جہاں تک اسلامی ممالک کا تعلق ہے تو وہ سلطنتِ برطانیہ کے قبضے سے آزادی حاصل کرنے کے بعد سے ہی امریکہ، برطانیہ اور مغربی ممالک کی حمایت و دیگر عسکری ساز و سامان کے دستِ نگر (محتاج) رہے ہیں اور آج تک ہیں۔ مزید یہ کہ اِس امر سے بھی ہر خاص و عام واقف ہے کہ کوئی بھی اسلامی ملک آج جدید ترین عسکری (فوجی) ساز و سامان بنانے سے قاصر ہے۔ اب لوگ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ پاکستان نے تو ایٹم بم بنا لیا ہے تو قارئین کرام کو میں بتانا چاہوں گا کہ پاکستان نے جو ایٹم بم

اور میزائلز بنائے ہیں، اُن کو بنانے کے لئے جن معدنیات (Minerals)، جدید ترین ٹیکنولوجیکل آلات (Technological Instruments)، Metals اور کیمیائی مواد کی ضرورت ہوتی ہے، وہ پاکستان خود نہیں بناتا بلکہ پاکستان وہ تمام چیزیں امریکہ، برطانیہ یا مغربی ممالک سے ہی منگواتا ہے۔ یعنی پاکستان میں ابھی یہ صلاحیت موجود ہی نہیں ہے کہ وہ خود سائنسی تحقیق کر کے کوئی نئی چیز تخلیق کر سکے۔ ہاں البتہ بنی بنائی چیزوں کو باہر سے منگوا کر اُنہیں جوڑ کر کوئی چیز بنانا ہرگز پاکستان کی ایجاد کردہ تخلیق قرار نہیں دی جا سکتی۔

بہرحال بات کہاں سے کہاں بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ہاں تو میں حماس کی جانب سے اسرائیل پر کئے جانے والے راکٹ اٹیکس بشمول پیرا گلائیڈرز حملوں کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ اب اِس موضوع سے جُڑی کچھ مزید باتیں سوالات کی شکل میں کرنا چاہوں گا۔ اِن باتوں کو آپ کو انتہائی غور سے پڑھنا ہوگا تاکہ نفسِ مضمون سمجھنے میں آسانی ہو۔

میرے اس مقالے کو پڑھنے والے آپ سب لوگ بتائیں کہ کیا کبھی فلسطین کی جانب سے اسرائیل پر اُس طرح حملے کیے گئے جس طرح 7، اکتوبر 2023ء کو حماس نے اسرائیل پر کیے؟ آپ سب جانتے ہوں گے کہ فلسطین کی آزادی کی جدوجہد کرنے والا کوئی ایک اور صرف ایک گروپ ہی نہیں ہے بلکہ کئی گروپس ہیں جن کا تذکرہ میں اِس تحریر میں پہلے کر چکا ہوں۔ اب یہاں یہ سوال کرنا بھی غیر ضروری نہیں ہوگا کہ فلسطین میں آزادی کیلئے جدوجہد کرنے والے جتنے بھی گروپس موجود ہیں کیا اُن میں سے کسی ایک گروپ نے بھی 7، اکتوبر 2023ء کو حماس کے راکٹ اٹیکس سے پہلے اسرائیل پر اتنی بڑی تعداد میں راکٹس داغے؟ اگر آپ کا جواب نہیں میں ہے تو پھر میرا یہ سوال کرنا بھی جائز بنتا ہے کہ حماس کے حملے کے جواب میں اسرائیل نے 8، اکتوبر 2023ء سے اسرائیلی قبضے سے محفوظ رہ جانے والے (یعنی اسرائیلی قبضے سے بچ جانے والے) تمام ہی فلسطینی علاقوں پر جو فضائی، بحری اور برّی حملے کیے ہیں وہ آج ایک ماہ سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود کس طرح اور کیونکر جاری ہیں؟ اسرائیل کے اِن حملوں کی وجہ سے 11 ہزار سے زائد فلسطینی مرد، خواتین اور معصوم بچے ہلاک ہوئے اور ایک لاکھ سے زائد زخمی ہوئے اور تادمِ تحریر روزانہ سینکڑوں افراد کی ہلاکتوں اور زخمی ہونے کا سلسلہ جاری ہے۔

اب مزید سوالات ذہن کو جھنجھوڑ رہے ہیں کہ 1948ء میں اسرائیل کی ریاست قائم ہو جانے کے بعد

فلسطین نے کتنی مرتبہ اسرائیل پر فضائی، زمینی اور بحری حملے کیے؟.....1948ء سے لیکر آج تک فلسطین نے اسرائیل پر حملے کر کے کتنے اسرائیلی علاقوں پر قبضے کیے؟ اور کتنی بڑی تعداد میں اسرائیلیوں کو اُن کے گھروں سے جبراً بیدخل کیا؟ .....کتنی اسرائیلی بستیوں کو مسمار کیا.....؟ فلسطین نے کتنی اسرائیلی بستیوں میں آباد کار (Settlers) کے نام پر فلسطینیوں کی آبادکاریاں کیں؟

اِس بات کا بھی سچائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے کہ 1948ء کے بعد سے لیکر آج تک اسرائیل اور فلسطین کے درمیان جتنی چھوٹی بڑی جنگیں ہوئیں اُن چھوٹی بڑی جنگوں میں کتنے اسرائیلی اور کتنے فلسطینی ہلاک وزخمی ہوئے؟

مزید ایک اور سوال یہ ہے کہ 7، اکتوبر 2023ء کو حماس کے حملے کے بعد اسرائیل نے اب تک جتنے حملے کیے ہیں جو آج تک جبکہ میں یہ تحریر لکھ رہا ہوں، جاری ہیں جس کی وجہ سے فلسطین کی تازہ ترین صورتحال انتہائی ہولناک ہو چکی ہے، کیا یہ انسانی تاریخ میں ہونے والے بڑے سانحات میں سے ایک اور بڑا انسانی المیہ نہیں؟

آج فلسطین میں ہر طرف تباہی ہے، وہاں ہلاک وزخمی ہونے والے فلسطینیوں کیلئے نہ اسپتال دستیاب ہیں، نہ ہی ادویات ہیں، وہاں نہ پانی ہے، نہ گیس ہے اور نہ ہی بجلی ہے اور نہ ہی کھانے پینے کی اشیاء دستیاب ہیں اور نہ ہی روزمرہ استعمال کی اشیاء دستیاب ہیں.....اور اگر کچھ امدادی ادارے، امدادی سامان لیکر وہاں پہنچے بھی تو اُنہیں متاثرہ علاقوں میں بچ جانے والے فلسطینیوں تک پہنچنے میں کون رکاوٹ بنا ہوا ہے؟.....انسانیت کے علمبردار کہاں ہیں؟.....اقوامِ متحدہ کہاں ہے؟.....اقوامِ متحدہ کا انسان کے بنیادی حقوق کا چارٹر کہاں ہے؟ .....اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل اینٹونیو گوٹیررس (Antonio Guterres) کے احکامات اور اپیلوں پر عمل درآمد کیوں نہیں ہو رہا ہے؟.....کیا آج اقوامِ متحدہ کا وجود خود ایک سوالیہ نشان نہیں بنا ہوا ہے؟.....آخر عالمی انسانیت کا ضمیر کہاں اور کس جگہ مدفون ہو چکا ہے؟

قارئین کرام!

ہم جنگِ عظیم اوّل اور دوئم کے بعد کیا کچھ کھو چکے ہیں لیکن افسوس کہ ہم نے اُس سے آج تک کوئی سبق حاصل نہیں کیا، آخر کیوں؟

آخر ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جنگ صرف اور صرف تباہی اور بربادی لاتی ہے، جنگ کسی بھی مسئلہ کا حل نہیں ہوتی، جنگ کبھی بھی اور کسی بھی صورت میں انسانیت کی فلاح کی ضامن نہیں ہوتی۔ بار بار کی جنگوں اور انسانی جان و مال کی بربادی کے بجائے ہم اپنے اپنے سوئے ہوئے ضمیر کو کیوں نہیں جگاتے؟......ہم رنگ و نسل، زبان اور علاقائی تعصب سے آخر کب باہر آئیں گے؟......ہم رنگ و نسل کے فرق کو کب مٹائیں گے؟......ہم مذہبی بنیادوں پر نفرت سے باہر آکر مذہبی رواداری کے قیام کیلئے کب آگے بڑھیں گے؟

ان تمام باتوں سے بڑھ کر کوئی اور چیز یا بات ہے تو وہ صرف اور صرف احترامِ انسانیت ہے۔ احترامِ انسانیت کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ ہم احترامِ انسانیت پیدا کرنے کیلئے اپنے ضمیر کے مطابق یہ کیوں نہیں سوچتے کہ آخر ہم کب ہوشمندی کے ساتھ احترامِ انسانیت کیلئے اپنا اپنا مثبت کردار ادا کریں گے۔

ماحاصل......(Out Come)

خلاصہءِ تحریرِ تمام یا ماحصل تحریر......سچ اور کڑوے سچ کے ساتھ!

اِس دنیا بھر میں رہنے والے افراد کی تعداد 1940ء سے لیکر آج 2023ء تک کہاں سے کہاں تک جا پہنچی ہے، اُس کی تفصیل درج ذیل ہے:

1940 ------ Approximately ----- 2.3 Billion

1950 ------ Approximately ----- 2.5 Billion

1960 ------ Approximately ------ 3.0 Billion

1970 ------ Approximately ------ 3.7 Billion

1980 ------ Approximately ------ 4.4 Billion

1990 ------ Approximately ------ 5.3 Billion

2000 ------ Approximately ----- 6.1 Billion

2010 ----- Approximately ------ 6.9 Billion

2020 ----- Approximately ------ 7.8 Billion

2023 ----- Approximately ------ 8.0 Billion

اسی طرح 1940ء میں ممالک کی تعداد میں ہر ایک دہائی کے بڑھنے کے ساتھ 2023ء تک مزید کتنے ممالک کا اضافہ ہوا، ملاحظہ کیجئے۔

1940 ------ Approximately ----73

1950 ------ Approximately ----76

1960 ------ Approximately ---- 106

1970 ----- Approximately ---- 130

1980 ----- Approximately ---- 150

1990 ----- Approximately ---- 175

2000 ----- Approximately ---- 192

2010 ----- Approximately ---- 194

2020 ----- Approximately ---- 195

2023 ----- Approximately ---- 195

قارئین کرام!

اب سوچنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جنگِ عظیم اوّل اور جنگِ عظیم دوئم کے بعد دنیا میں آج 2023ء تک تیسری جنگِ عظیم نہیں ہوئی جس کی وجہ سے لاکھوں کروڑوں افراد کے مرنے یا مارنے کا سلسلہ عالمی سطح پر کم

ہوگیا اور تنازعات کے خاتمے کیلئے جنگ وجدل کے بجائے بات چیت کا راستہ اختیار کیا جاتا رہا۔ تمام تر اختلافی تنازعات کا حل افہام وتفہیم سے نکالنے کی کوششوں، تنازعات کے فریقین کا ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرنے اور تنازعات کا حل جنگوں کے بجائے مذاکرات کے ذریعے نکالنے کے نتیجے میں نئے نئے ممالک کا وجود عمل میں آتا رہا اور اس طرح موجودہ دنیا تیسری جنگِ عظیم سے تاحال محفوظ ہے۔

اگر ہم اختلافی تنازعات پر جنگیں اور صرف جنگیں ہی جاری رکھتے اور تنازعات کے فریقین اپنی اپنی ضدوں پر اَڑے رہتے اور یہ کہتے کہ تمہارا وجود ہی غلط ہے اور میرا وجود ٹھیک اور درست ہے تو ہم آج تک جنگوں میں ہی اُلجھے اور پھنسے رہتے اور جنگوں کا سلسلہ بھی آج تک اُسی طرح جاری رہتا جس طرح گزشتہ 75 برسوں سے اسرائیل اور فلسطین تنازعے میں اُلجھے اور پھنسے ہوئے ہیں اور تاحال چھوٹی بڑی جنگوں میں اُلجھے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے تباہی وبربادی اور انسانی جانوں کے اتلاف کے علاوہ اسرائیل اور فلسطین کے درمیان موجود تنازعے کا حل نکلتا نظر نہیں آرہا ہے۔ اگر پوری دنیا میں تنازعات کے حل کیلئے بات چیت نہ کرنے اور ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم نہ کرنے کا سلسلہ جاری رہتا تو نئے نئے ممالک دنیا کے نقشے پر ایک آزاد ملک کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے نہیں آتے۔

اب میں واپس 75 سالوں سے جاری فلسطین۔ اسرائیل تنازعے کی طرف آتا ہوں۔ میں آگے چل کر جو کچھ اپنی سوچ وفکر کے مطابق تحریر کروں گا، وہ تاریخی حقائق کی روشنی میں میری ذاتی سوچ وفکر ہوگی جسے بہت سے قارئین صحیح سمجھیں گے یعنی وہ میری تحریر کردہ باتوں، خیالات اور سوچ وفکر سے اتفاق کریں گے اور بہت سے قارئین اُسے غلط سمجھیں گے یعنی وہ میری تحریر کردہ باتوں، خیالات اور سوچ وفکر سے اختلاف کریں گے۔

میں یہاں اِس امر پر زور دینا چاہوں گا کہ خواہ پڑھنے والے میری تحریر کردہ باتوں، خیالات اور فکر وسوچ وفلسفہ سے اتفاق کریں یا اختلاف کریں، میری نظر میں اتفاق اور اختلاف کرنے والوں کا احترام رہے گا کیونکہ سوچ وفکر کے اظہار کی آزادی اگر میں اپنے لئے پسند کرتا ہوں اور اُسے اپنا حق سمجھتا ہوں تو پھر میں کس طرح دوسروں کی سوچ وفکر کے اظہار اور اتفاق یا اختلاف کے حق پر پابندی لگانے کا تصور کرسکتا ہوں یا اُن پر پابندی لگانا اپنا حق سمجھ سکتا ہوں؟

قارئین کرام!

میں اپنی اِس پوری تحریر میں تاریخی حقائق کی روشنی میں جو کچھ تحقیق کر سکا، اُس کے مطابق کافی تفصیل کے ساتھ اسرائیل اور فلسطین تنازعے کو تحریر کرنے کی جو کوشش کی ہے، میں اِس کوشش میں کتنا کامیاب رہا یا ناکام رہا اِس کا فیصلہ تو آپ قارئین کرام ہی بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔

اب میں آگے چل کر پوری کوشش کروں گا کہ اپنی تحریر کو مزید مختصر سے مختصر کر سکوں۔ جیسا کہ میں اپنی بیان کردہ تحریر میں متعدد بار بیان کر چکا ہوں کہ اسرائیل کی آزاد ریاست 1948ء میں قائم ہوئی تھی اُسی سال یعنی 1948ء میں عرب۔اسرائیل جنگ شروع ہوئی جو 1949ء میں ختم ہوئی۔

قارئین کرام!

اب آپ اس پر ضرور نہ صرف خصوصی توجہ دیں بلکہ انتہائی غور و فکر بھی کریں کہ اُس جنگ کا نتیجہ کیا نکلا۔ عرب اتحاد کو شکست ہوئی اور اسرائیل کو فتح حاصل ہوئی۔ اسرائیل کی اُس فتح سے خطہ میں ایک اور نئے بحران نے جنم لیا کیونکہ اقوامِ متحدہ نے جتنا علاقہ اسرائیل کو دیا تھا، اُس جنگ کے بعد اسرائیل نے اقوامِ متحدہ کی جانب سے دیئے گئے اُس طے شدہ رقبے کو بڑھا کر فلسطین کے مزید علاقوں پر قبضہ کر لیا جس کی وجہ سے لاکھوں فلسطینیوں کو ہجرت کرنا پڑی اور اِس طرح فلسطینی مہاجرین کا ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

اب قارئین کرام، اس بات پر مزید غور کریں کہ عرب۔اسرائیل جنگ کے اختتام کے بعد ہونے والی دیگر چھوٹی بڑی جنگوں میں اسرائیل کا کتنا فائدہ ہوا اور فلسطین کو کتنے نقصانات کا سامنا کرنا پڑا؟ اِس سوال کا جواب میں اپنی تحریر کے پہلے حصے میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں کہ اُن تمام چھوٹی بڑی جنگوں کا ہولناک نتیجہ دونوں طرفین یعنی (اسرائیل اور فلسطین) کے لاکھوں معصوم و بے گناہ شہریوں کی ہلاکت کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا۔ اب اگر ہم مزید اِس بحث و مباحثے میں پڑے رہیں کہ دونوں فریقین میں سے کس فریق کا زیادہ اور کس فریق کا کم نقصان ہوا تو یہ بحث و مباحثہ کسی حتمی نتیجے کے بغیر ہی جاری رہے گا اور مزید معصوم و بے گناہ انسانی جانوں کا اتلاف بھی ہوتا رہے گا۔ لہٰذا میں اِس دیرینہ اسرائیل۔فلسطین تنازعے کا حل اپنے بیان کردہ فلسفہء

حقیقت پسندی اور عملیت پسندی (Realism and Practicalism) کو سامنے رکھ کر پیش کرنے کی جسارت کروں گا اور وہ یہ ہے کہ ہمیں اِس پرانے اسرائیل۔فلسطین تنازعے کے زمینی حقائق کو تسلیم کرنا پڑے گا اور اُن حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں آئندہ کی ایسی حکمتِ عملی بنانی ہوگی جو برسوں سے جاری جنگ کے خاتمے کا سبب بن سکے۔

قارئین کرام!

میں آپ سے سوالات کی شکل میں کچھ مزید باتیں کرنا چاہوں گا،

(1) کیا اسرائیل کو امریکہ، برطانیہ اور مغربی ممالک کی حکومتوں اور طاقتور اشرافیہ کی حمایت حاصل نہیں ہے؟

(2) کیا یہ زمینی حقیقت نہیں ہے کہ فلسطین کو ماسوائے ایک یا دو ممالک کے کسی بھی ملک بشمول اسلامی ممالک کی حکومتوں اور طاقتور اشرافیہ کی کوئی عملی حمایت حاصل نہیں ہے؟

(3) کیا یہ زمینی حقیقت نہیں ہے کہ اقوامِ متحدہ کے باقاعدہ ممبر ممالک کی کُل تعداد جو اِس وقت 193 بنتی ہے، اُن ممبران میں سے 164 ممبران نے اسرائیل کے وجود کو ایک آزاد ریاست کے طور پر تسلیم کرلیا ہے؟

(4) کیا یہ زمینی حقیقت نہیں ہے کہ سپر پاورز میں سے ایک بڑی سپر پاور روس (Russia) نے 17، مئی 1948ء کو اسرائیل کو باقاعدہ طور پر ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے تسلیم کیا؟

(5) کیا یہ زمینی حقیقت نہیں ہے کہ ایک اور سپر پاور چائنا (China) نے بھی 24، جنوری 1992ء کو اسرائیل کو ایک آزاد ریاست کے طور پر تسلیم کرلیا؟

(6) کیا یہ ایک زمینی حقیقت نہیں کہ اسرائیل کو تو ایک ریاست کے طور پر اقوام متحدہ اور اُس کے 164 رکن ممالک نے تسلیم کرلیا ہے لیکن تمام تر معاہدوں کے باوجود فلسطین کو ایک آزاد و خودمختار ریاست کے طور پر نہ تو اقوامِ متحدہ نے اب تک تسلیم کیا ہے اور نہ ہی کسی اور ملک نے تسلیم کیا ہے۔ کیا یہ حقیقت کسی المیہ سے کم نہیں ہے؟

(7) کیا یہ زمینی حقیقت نہیں ہے کہ ''پاکستان'' سمیت جن اسلامی ممالک نے اسرائیل کی ریاست کو اب تک اعلانیہ یا باقاعدہ طور پر تو تسلیم نہیں کیا ہے لیکن کیا اُن ممالک کے بھی اسرائیل کے ساتھ غیر اعلانیہ یا خفیہ روابط نہیں

ہیں؟

(8) کیا یہ زمینی حقیقت نہیں ہے کہ موجودہ اسرائیل۔فلسطین جنگ میں کوئی ایک بھی اسلامی ملک اعلانیہ طور پر اپنے ٹھوس اور واضح لائحہ عمل کے ساتھ عملی میدان میں فلسطین کی حمایت کرنے سامنے نہیں آیا؟

قارئین کرام!

میں ان بیان کردہ نکات اور سوالات کی روشنی میں اپنی جورائے یہاں رقم کرنے جارہا ہوں وہ یہ ہے کہ فلسطین کا وجود، اسرائیل کے وجود سے ہزاروں سال پرانا ہے جبکہ گزشتہ 75 برسوں سے اسرائیل کا وجود ایک ایسی حقیقت بن کر سامنے آیا ہے کہ اقوامِ متحدہ کے باقاعدہ ممبران میں سے 164 ممالک، اُسے یعنی اسرائیل کو ایک آزاد وخودمختار ریاست کے طور پر تسلیم کرچکے ہیں۔لہٰذا آج کی زمینی حقیقت یہ ہے کہ فلسطین کا وجود حقیقی ہے اور اسرائیل کا وجود بھی ایک حقیقت بن چکا ہے۔

میں اقوامِ متحدہ سمیت تمام ہی بڑی اور طاقتور قوتوں کے سامنے اپنا یہ مؤقف بیان کرنا چاہوں گا کہ اقوامِ متحدہ کے طے کردہ تقسیمِ فلسطین پلان (United Nations's Partition Plan) جس کے تحت 55 فیصد حصہ یہودیوں (Jewish) کی ریاست کو ملے گا اور عرب ریاست کو 45 فیصد حصہ ملے گا۔

میں حقائق کی روشنی میں یہاں اقوام متحدہ کے سامنے انصاف پر مبنی ایک مطالبہ رکھنا چاہوں گا کہ اسرائیل کو 45 فیصد حصہ دیا جائے اور فلسطین کو 55 فیصد حصہ دیکر 75 سال پرانے اسرائیل۔فلسطین کا تنازعہ مستقل بنیادوں پر حل کیا جائے اور اگر میری رائے سے کسی کو اتفاق نہ ہو تو کم ازکم جس طرح اقوامِ متحدہ نے ایک آزاد ریاستِ اسرائیل کو تسلیم کیا تھا اُسی طرح قدیم فلسطین کی ایک آزاد وخودمختار ریاست کا قیام بھی عمل میں لایا جائے تاکہ اِس خطے میں معصوم و بے گناہ انسانوں کے کُشت وخون کے جاری سلسلے کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کیا جاسکے اور اس طرح خطے میں پائیدار اور مستقل امن قائم کیا جاسکے۔

میں اپنے تخلیق کردہ فلسفہء حقیقت پسندی وعملیت پسندی (Realism and Practicalism) کے مطابق موجودہ اسرائیل۔فلسطین تنازعے کے حل کے بارے میں اپنی مزید تجاویز پیش کرنا چاہوں گا۔

اسرائیل۔ فلسطین کے درمیان تنازع ایک پیچیدہ اور حساس مسئلہ ہے جس کے حل کے لیے دونوں فریقوں کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی برادری کی شمولیت اور تعاون کی بھی اشد ضرورت ہوگی۔ پرامن حل کی طرف بڑھنے میں مدد کے لیے چند تجاویز درج ذیل ہیں:

1۔ مکالمہ اور گفت وشنید:

جیسا کہ میں نہایت تفصیل سے یہ بیان کر چکا ہوں کہ ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرنے اور جنگ وجدل ختم کر کے بات چیت کا راستہ اختیار کرنے سے ہی اس تنازعے کا حل نکل سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ وقت کی اشد ضرورت ہے کہ مزید انسانی جانوں کے اتلاف اور تباہی کے سلسلے کو روکنے کے لئے اقوامِ متحدہ اور عالمی برادری خصوصاً بڑی طاقتوں کی جانب سے فریقین پر زور دیا جائے کہ وہ ثالثوں کی موجودگی میں براہ راست مذاکراتی عمل میں شامل ہوں اور اپنی شکایات کے ازالے اور تنازعے کے حل کی ایک مشترکہ بنیاد تلاش کریں کیونکہ ایک دوسرے کے نقطہءنظر کو سمجھنے کے لیے کھلی اور ایماندارانہ بات چیت بہت ضروری ہے۔

2۔ دو ریاستی حل:

خطے میں مزید قیمتی جانوں کے تحفظ اور مستقل بنیادوں پر جنگ وجدل کی صورتحال سے بچنے کیلئے ''جیو اور جینے دو'' کی پالیسی پر عمل کیا جائے، اِس پالیسی کے تحت اسرائیل اور فلسطین کے عوام کو ایک دوسرے کی ریاست کو تسلیم کرنا چاہیے کیونکہ اقوام متحدہ خود بھی فلسطین میں دو ریاستی حل کی حامی ہے لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ آج وقت کا یہی تقاضہ ہے کہ فریقین بمباری اور حملے بند کر کے بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ دو ریاستی حل کو تسلیم کرتے ہوئے آگے کی جانب بڑھیں، جہاں اسرائیل اور فلسطین محفوظ سرحدوں کے ساتھ، ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے آزاد ریاستوں کے طور پر رہ سکیں۔

3۔ انسانی حقوق کا احترام:

میں سمجھتا ہوں کہ احترامِ انسانیت، رنگ، نسل، مذہب، عقیدے اور علاقائی وابستگی سے بالاتر اور عظیم ہے

لہٰذا خطے میں آباد تمام اقوام سے وقت کا یہی تقاضہ ہے کہ وہ رنگ، نسل، مذہب اور عقیدے کی تفریق سے بالاتر ہوکر انسانیت کی بقاء، اُس کے احترام اور انسانی حقوق کے تحفظ کو اوّلیت دیں۔ احترامِ انسانیت، مساوات، انصاف اور بین الاقوامی قانون کا احترام کرتے ہوئے ہر قوم کو عزت اور آزادی کے ساتھ جینے کا حق دینے سے ہی ہر علاقے اور خطے میں مستقل اور پائیدار امن کے قیام میں مدد مل سکتی ہے۔

4۔ بین الاقوامی حمایت:

بین الاقوامی برادری، اقوامِ متحدہ خصوصاً بڑے اور امیر و طاقتور ترین ممالک جنگ بندی اور مستقل امن کے سلسلے میں فعال کردار ادا کریں اور یہ عمل سفارتی کوششوں، اقتصادی مدد اور حفاظتی ضمانتوں کے ذریعے ہی کیا جاسکتا ہے۔

یاد رکھیں، خطے میں امن کا حصول ایک پیچیدہ کام ہے جس کے لیے تمام فریقین کو عزم، صبر اور سمجھ بوجھ سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اِس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ طاقت کے ذریعے کوئی بھی قوم کسی علاقے پر قبضہ کرکے اُس علاقے کو مقبوضہ علاقہ تو بنا سکتی ہے اور مقبوضہ علاقے میں رہنے والے عوام کو اپنا محکوم تو ضرور بنا سکتی ہے لیکن طاقت کے ذریعے کسی بھی دوسری قوم کے وجود کو ختم نہیں کرسکتی۔

قارئین کرام!

میں نے اپنی سوچ وفکر کے مطابق فلسفہء حقیقت پسندی (Realism) کے تحت زمینی حقائق کا مختصراً خاکہ آپ کے سامنے رکھ دیا ہے اور عملیت پسندی (Practicalism) کے مطابق اسرائیل۔فلسطین تنازعے کے حل کے ساتھ ساتھ خطے میں مستقل اور پائیدار امن کے قیام کا فارمولا یا پلان بھی پیش کردیا ہے۔

قارئین کرام!

میں اپنے تخلیق کردہ فلسفہء حقیقت پسندی وعملیت پسندی (Realism and Practicalism)

کے مطابق یہ سمجھتا ہوں کہ زمینی حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ دنیا میں موجود کون سی چیز انسان کے فائدے میں ہے اور کون سی نقصان دہ ہے اور یہ سب کچھ جان لینے کے بعد انسان کیلئے جو کچھ بھی فائدہ مند ہو اُسے عملی طور پر کس طرح اپنایا جائے یا استعمال کیا جائے۔ اسی طرح جو کچھ بھی انسان کیلئے نقصان دہ ہو اُس سے کس طرح دُور رہا جائے، پرہیز یا اجتناب کیا جائے اور اگر کسی نقصان دہ چیز کا استعمال انسان کے فائدے کیلئے بھی کیا جاسکتا ہو تو انسانیت کی بقاء اور ایک عظیم مقصد کی خاطر اُس کو استعمال کرنے کیلئے عملی طور پر کس طرح کی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ اگر کوئی نقصان دہ چیز، انسان کی بہتری، بقاء وسلامتی اور فلاح کیلئے بھی استعمال کی جاسکتی ہو تو ہمیں اُس بات کا ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ اُس نقصان دہ چیز کو کس طرح اور کیسے استعمال کیا جانا چاہیے اور جس کے استعمال سے کن کن تدابیر کو اختیار کر کے انسان کو نقصان پہنچنے کے عمل سے بچایا جاسکے مثلاً یورینیم جس کی علامت (Symbol) "U" ہے اور یہ ایک ایسا عنصر (Element) ہے جس کے ذریعے بجلی بھی پیدا کی جاسکتی ہے اور جس سے انتہائی تباہ کن نیوکلیئر ہتھیار بھی بنائے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح پارا (Mercury) ہے جس کا Symbol "Hg" ہے۔ پارے کا استعمال انسانی جسم کا درجہ حرارت ناپنے کے آلے تھرمامیٹر، انسان کے بلڈ پریشر ناپنے کے آلے (Sphygmomano meter) اور ہوا کے دباؤ کو ناپنے والے آلے بیرومیٹر میں کیا جاتا ہے جبکہ دوسری طرف پارا (Mercury) انسان کی صحت وزندگی اور ماحولیات کیلئے زہریلا (Poisonous) بھی ہوتا ہے اس کے باوجود اُسے انسانیت کی فلاح و بہبود کیلئے استعمال کیا جاتا ہے.....مگر انتہائی احتیاطی اور ضروری تدابیر کے ساتھ۔

قارئین کرام!

میں اپنے تحریر کردہ اِس تحقیقی مقالے (Thesis) کے ذریعے اپنے فلسفہء حقیقت پسندی (Realism) اور عملیت پسندی (Practicalism) کے مطابق صرف یہ چاہتا ہوں کہ پوری دنیا میں موجود تمام تنازعات، تعصّبات، نفرتوں، کدورتوں اور بغض وعناد کا کسی طرح خاتمہ کیا جائے اور ماضی کی تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے

اور اِس کے زمینی اور سچے حقائق کو تسلیم کر کے اور اُن کا جائزہ لیتے ہوئے دنیا بھر میں موجود ہر ملک میں پائی جانے والی بے چینیوں کے خاتمے..... حقوق سے محرومی کے خاتمے..... رنگ و نسل کے امتیاز کے خاتمے..... ایک دوسرے کے وجود کو کھلے دل سے تسلیم کرنے..... سوچ و فکر کے تضادات یا اختلافات کے خاتمے کیلئے جنگ و جدل کے بجائے بات چیت کا راستہ اختیار کرنے..... مذہبی رُجعت پسندی کے خاتمے..... مذہبی رواداری کو قائم کرنے ..... مرد و خواتین کے امتیاز کو مٹانے..... برتری اور کمتری کی سوچ کا خاتمہ کرنے کیلئے بااثر ممالک بالخصوص اقوامِ متحدہ کو اپنا اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور اس بات کو یقینی بنانا اشد ضروری ہے کہ تضادات و اختلافات کے خاتمے اور تنازعات کے حل کیلئے جنگ یا طاقت کا ناجائز استعمال کرنے کے بجائے خلوصِ نیت اور دیانتداری کے ساتھ بات چیت کا راستہ اختیار کیا جائے۔

24، اکتوبر 1945ء کو قائم ہونے والی اقوامِ متحدہ کی تشکیل اسی لئے عمل میں لائی گئی تھی کہ دنیا میں ہونے والے ہر قسم کے ظلم و ستم و بربریت کا خاتمہ کیا جا سکے اور جنگ عظیم اوّل اور دوئم کے ہولناک نتائج کی روشنی میں دنیا بھر میں آئندہ کوئی تیسری ممکنہ عالمی جنگ سے بچا جا سکے اور دنیا بھر میں احترامِ انسانیت کے قیام کیلئے ہر ممکنہ اقدامات کر کے دنیا بھر کے ممالک کو پابند بنایا جا سکے کہ وہ یونائٹڈ نیشنز چارٹر پر عملدرآمد کریں۔

میں ذاتی طور پر دنیا بھر میں اور دنیا کے کسی بھی ملک میں موجود تنازعات کو طاقت کے ذریعے حل کرنے کا خاتمہ چاہتا ہوں، دنیا میں انصاف اور انصاف کے نظام کا عملی طور پر نظر آنے والا عمل دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ جنگ اور جنگ کے مکمل خاتمے اور امن اور صرف امن کے قیام کا عملی نمونہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں مختصراً یہ کہنا چاہوں گا کہ میرا مشن و مقصد صرف اور صرف جنگ سے نفرت اور امن سے محبت ہے۔

قارئین کرام!

اب آپ میرے تاریخی حقائق کی روشنی میں تیار کردہ اِس تحقیقی مقالے (Thesis) کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے اپنے ضمیر کے مطابق بہتر طور پر فیصلہ کریں کہ میرا تحریر کردہ مقالہ کس حد تک درست ہے اور کس حد تک غلط ہے، اِس کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔

میری آپ تمام قارئین سے بصدِ احترام درخواست ہے کہ اگر میری بیان کردہ باتوں میں سے کوئی بات کسی کو ناگوار گزری ہو تو مجھے معاف فرمائیں، میری اصلاح اور اپنے خیالات سے آگاہ کرنے کیلئے نیچے درج کیے جانے والے Email Address پر مجھے ضرور آگاہ کریں۔

عالمی امن، جنگ وجدل کے خاتمے، انسانیت کی بقاء اور خصوصاً مشرقِ وسطیٰ کے خطے میں مستقل قیامِ امن کے لئے دعا گو

احقر

الطاف حسین

بانی وقائد

متحدہ قومی موومنٹ

Muttahida Quami Movement (MQM)

International Secretariat (London)

185 Whitchurch Lane

Edgwar, Middlesex

HA8 6QT

Email: mqm@mqm.org

Website: www.mqm.org

Phone: 0044 208 9527300

Photographs ..... تصاویر

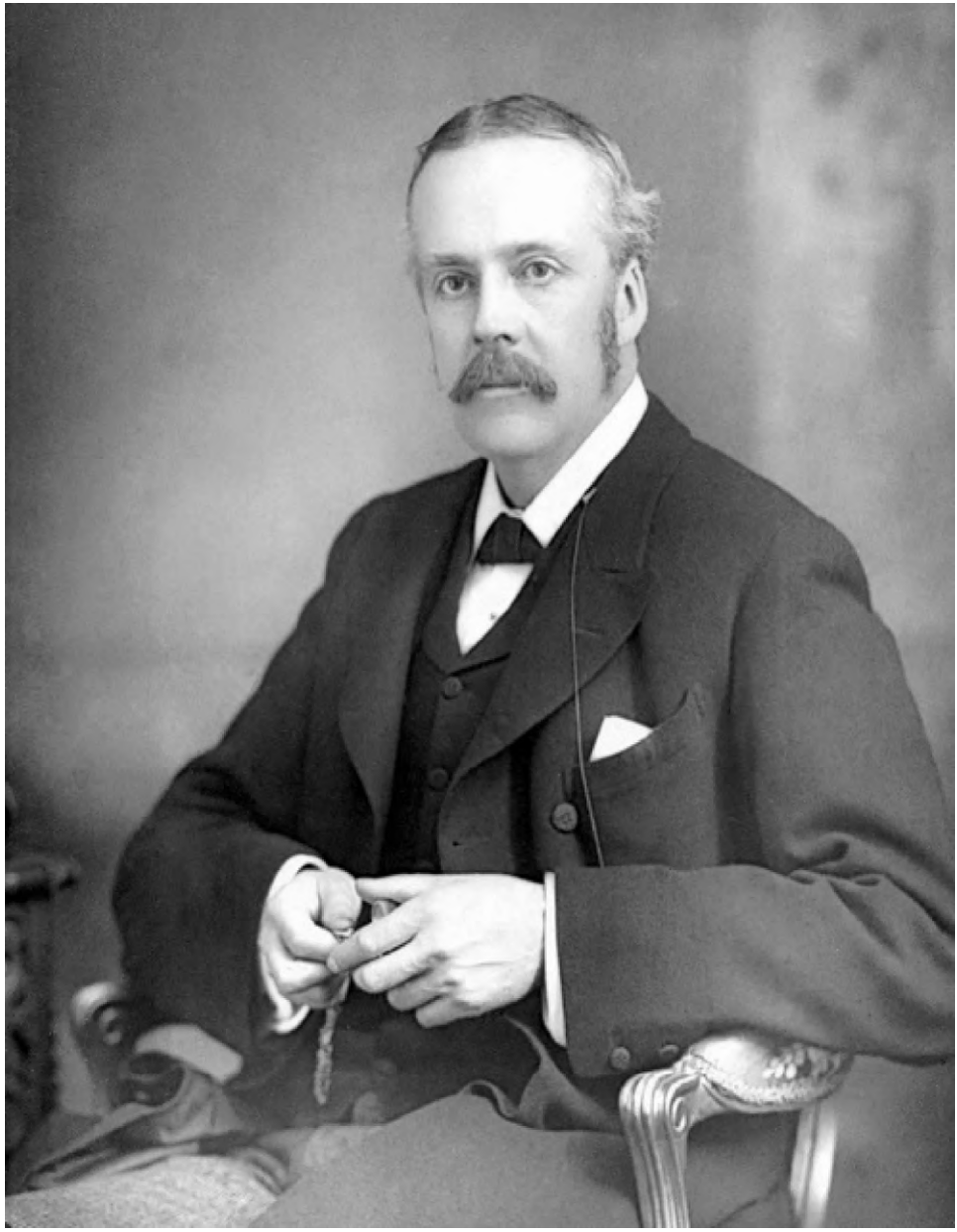

Arthur Balfour

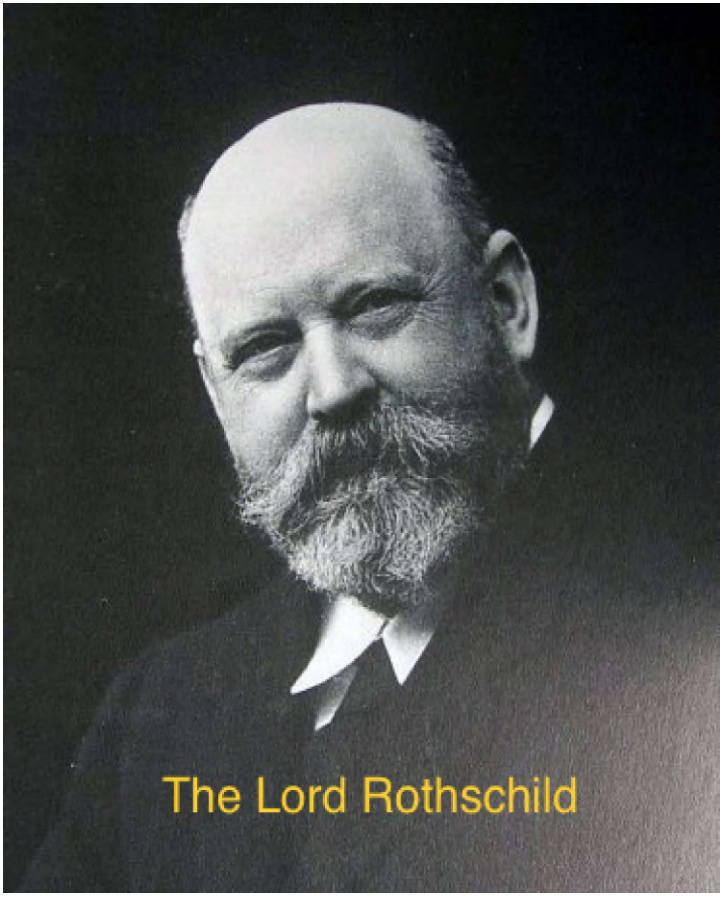

Lord Rothschild

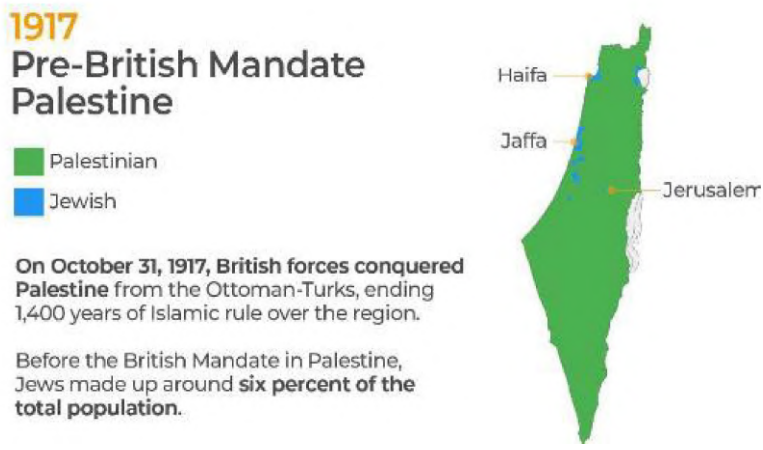

Map of 1917

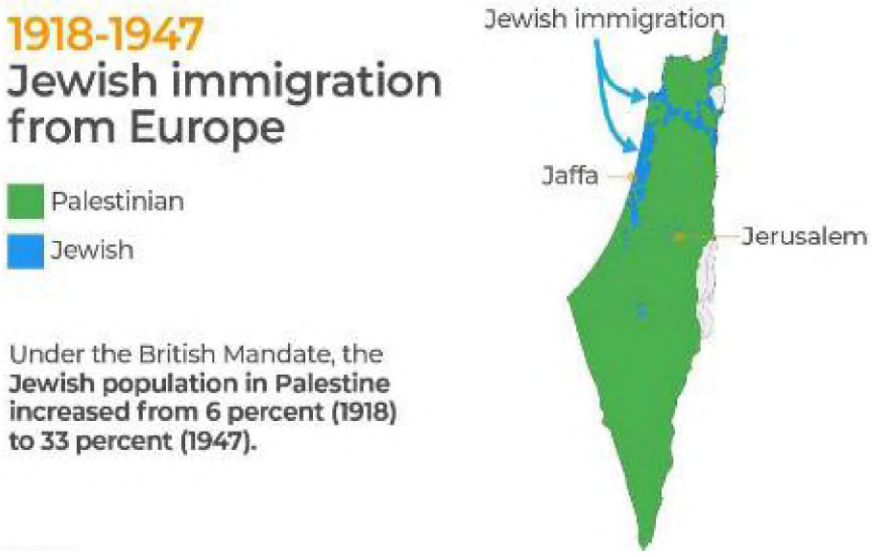

Map of 1918 - 1947

ISRAEL-PALESTINE CONFLICT

GLIMPSE OF THE PAST AND PLIGHT OF THE PRESENT

Research Paper
In Light Of Historical Facts

By
Altaf Hussain